ہندوستان کے لوگ

مصنفہ ظفر چوہدری

جنتا پبلشرز لمیٹڈ لاہور

فہرست

صفحہ

پیش لفظ

ان اوراق پر جو کالے کالے داغ ہیں۔ میرے دماغ کی سوچ کے صفحۂ دل کے وہ دھندلے نقوش ہیں جو میرے ملک کی چلتی پھرتی بے بس زندہ لاشوں پر روسی سامراج کی بدولت دیکھنے میں آئے۔ جیل کی تنگ و تار خلوت نے مجبور کیا۔ تو ٹوٹی ہوئی قلم کی زباں سے خون جگر کو بطور روشنائی استعمال کر کے لکھنا شروع کیا۔ آپ اسے میری تصنیف نہیں بلکہ تالیف سمجھئے۔ زباں کو لچھے دار الفاظ سے آراستہ نہ کر سکا۔ نہ ہی موقعہ تھا کہ عوام یعنی جنتا کی زندگی سے متعلقہ باتوں کو وسعت دے کر لکھتا۔ اور نہ ہی حالات نے اجازت دی۔ یہ مختصر واقعات متعدد کتابوں سے اخذ کر کے پیش ناظرین کر رہا ہوں۔

رہائی کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ اب جنگ کی بدولت تمام پرانے نقشے یکسر بدل چکے ہیں۔ اس لئے اس زمانہ اسیری کے صحیح نقشے کو شائع کرنے کے لئے تمام کاروبار کو ادھورا چھوڑنا پڑتا تھا۔ مگر اس آڑے میں محترم پروفیسر جیدیو سیٹھی صاحب کا سپاس گزار ہوں جنہوں نے تازہ تازہ انکشاف کے ذریعہ کتاب کے مرتب کرنے میں اعانت کی

مخلص
ظفر چوہدری

محمد رفیق پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس میں چھپوا کر ادبستان لاہور سے شائع کیا۔

کسان تاریخ کے چکّر میں

پرانا نظام

انگریزی راج نے ہندوستان کے دیہی نظام کی کایا پلٹ دی ہے۔ گاؤں تو آج بھی وہی ہیں زمین بھی وہی ہے۔ اور ہم بھی انہیں کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ جن میں ہمارے بڑے بزرگ ہل چلاتے رہے ہیں۔ پھر ہماری حالت بزرگوں کی طرح اچھی کیوں نہیں۔ وہ کیوں خوشحال تھے۔ اور ہم کیوں بھوکوں مر رہے ہیں۔ کسان کہتا ہے۔ کہ خدا کو یہی منظور ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے امیر بنا دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے غریب رکھتا ہے۔ ہم اسے قصوروار نہیں قرار دیتے۔ وہ ایسا سوچنے میں حق بجانب ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ جن بنیادوں پر آج سے چند سو سال پہلے زرعی نظام کا محل کھڑا تھا وہ تو گر کر خاک میں مل چکا ہے۔

اجناس کے نرخ دنیا بھر کے نرخوں کے مطابق طے ہوتے ہیں۔ وہ پیداوار پنجاب کے کارخانوں میں مال تیار کرنے کی خاطر کرتا ہے۔ ان اندھی طاقتوں کا اسے بالکل پتہ نہیں۔ ہندوستانی کسان ضرب المثل طور پر سادہ ہے۔ دیہات کی سیر کرنے سے قبل یہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔ کہ پہلے پرانے دیہاتی نقشوں کو ذہن میں بٹھالیں۔ کارل مارکس کے نام سے کون واقف نہیں۔ آپ نے اپنی کتاب "سرمایہ" میں پرانے دیہات کا نہایت خوبصورت نقشہ کھینچا ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔

> کسان چھوٹی چھوٹی قوموں میں بٹ کر رہتے تھے (یاد رکھئے کہ قوم سے آپ کی مراد ۔۔ ایک گاؤں ہے۔ جس میں کاشتکار ترکھان (بڑھئی) لوہار الغرض گاؤں کے تمام باشندے شامل ہیں) زمین تمام اقوام کی مشترکہ ملکیت ہوتی ہے۔ کچھ تو

اس میں ہل جوتتے۔ باقی دستکاری اور دوسرے کام سرانجام دیتے ہیں۔ اس طرح محنت کی بانٹ نہایت عمدہ اور مضبوط بنیادوں پر قائم تھی۔ جس میں کوئی تبدیلی یا انقلاب رونما نہ ہوتا تھا آبادی کے ساتھ ساتھ قوم میں بھی بڑھتی رہتی تھیں نئی قوم پرانے سماجی نظام کی پیروی کرتی اور محنت کی اس بانٹ پر اپنی زندگی کی عمارت کھڑی کرتی۔ ہر قوم کے پاس ہزاروں ایکڑ زمین موجود ہوتی۔ اجناس وہی اگائی جاتی تھیں جو اس قوم کو ضرورت ہوتی۔ پیداوار کا بہت بڑا حصہ تو قوم خود کھپت کر لیتی۔ اس لئے وہ جنس نہ بن سکتا تھا۔

ان پرانی قوموں کی بناوٹ ہر جگہ ایک نہ تھی۔ سب سے سادہ شکل یہ تھی۔ کہ تمام قوم مل کر زمین پر محنت کرتی پیداوار مساوی طور پر آپس میں بانٹ لی جاتی۔ ہر قوم میں امداد دستکاری بھی جاری تھی۔ کوئی سوت کاتتا دوسرا بننے کا کام کرتا۔ ایک اور کو سردار بنا لیا جاتا۔ اس کے سپرد کئی کام ہوتے تھے۔ وہ پولیس افسر منصف یا جج اور ٹیکس اکٹھے کرنے کے سب کام کرتا تھا۔ اب پٹواری کو لیجئے۔ وہ کاشت کا حساب کتاب تیار کرتا۔ ایک اور افسر کے سپرد یہ کام تھے کہ وہ ملزموں پر مقدمے تیار کرتا۔ مسافروں کی حفاظت کا ذمہ وار ہوتا۔ اور انہیں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں پہنچانے میں رہنمائی کرتا۔ سرحدی پہرہ دار قوموں کی درمیانی سرحدوں پر سرحدوں کی نگرانی کرتا بہشتی تالابوں سے پانی لاکر گھروں میں تقسیم کرتے۔ لوہار ترکھان

زرعی آلات تیار کرتے تھے۔ اس طرح حجام سنار۔ ماسٹر۔ برہمن اور
شاعر تھے۔ آبادی بڑھ جاتی تو غیر مقبوضہ زمین پر ایک اور قوم
آباد ہو جاتی ہے۔

یہ ہے تعمیر ہمارے پرانے سماج کی۔ کیا سادہ اور سیدھی سادھی زندگی
قابل رشک نہیں۔ اعین ممکن ہے۔ اس زندگی میں آج کی طرح انواع و اقسام یہ رنگ
برنگ کے مزے موجود نہ ہوں لیکن اس سماج کی ایک نعمت کا ہی کیا کہنا ہے۔ اس سماج
میں ایک قوم اپنی ضروریات زندگی خود مہیا کرتی تھی۔ لیکن ہم بات بات میں ایک
دوسرے کے محتاج ہیں۔ پھر بھی یہ بہت دیر کی باتیں ہیں۔ ہم میں سے کوئی پیچھے مڑنا
پسند نہیں کرتا۔ آگے بڑھنا ہی زندگی کا آدرش یا نصب العین ہے۔ مگر پیچھے دیکھے
بغیر گذارا بھی نہیں۔ ماضی حال کا ایک لازمی حصہ ہے۔ اس لئے ماضی کا رخ کرنا ہی
پڑتا ہے۔ تاکہ اس کے مطالعہ سے مستقبل روشن بنایا جا سکے۔

اور باتوں کو چھوڑ دیجئے زمین کی ملکیت کے سوال کو ہی لیجئے اس کے متعلق
بھی جتنے منہ اتنی باتیں کہی جاتی ہیں۔ مارکس کی بات تو آپ سن چکے اب دوسرے
ماہروں کی گفتگو سنئے آج کے بڑے بڑے منصف اور عقلمند لوگ یہ کہتے ہیں
کہ زمین کی ذاتی ملکیت موجود تھی۔ مگر اس کے انتظامات ایک ریاست کی نگرانی میں
ہوتے تھے۔ زمین کے بڑے بڑے رقبے مال مویشیوں کے لئے مخصوص کر دئے
جاتے۔ ہر گاؤں میں غلہ کا ایک بہت بڑا حصہ محفوظ طور پر رکھ دیا جاتا۔ عبادت
گاہوں کے ساتھ وقف شدہ اراضی ٹیکس سے مستثنےٰ تھی۔ شاملات پر بھی ٹیکس
نہیں لگایا جاتا تھا۔ زمین متعدد قطعات میں بٹی ہوتی جن پر علیحدہ علیحدہ خاندان
کاشت کرتے تھے۔ ان زمینوں پر ان خاندانوں کے باقاعدہ حق ملکیت موجود
تھے۔ ان دونوں اہل الرائے میں ہمیں تو کوئی اختلاف نظر نہیں آتا ہے ابتدائی

طور پر زمین تمام قوم کی ملکیت ہو گی۔ پھر خاندانوں نے اس کے مختلف قطعوں پر اپنا اپنا حق ملکیت جما لیا۔ اپنانے کا مادہ انسان کے خمیر میں شامل ہے۔ پھر خاندانوں سے شخصی ملکیت تک نوبت آ گئی۔ اور ریاست تک ٹیکس پہنچانے کے لئے جاگیردار مقرر ہو گئے۔

جاگیردارانہ نظام

ہمارا جاگیردارانہ نظام یورپ کے جاگیردارانہ نظام سے بالکل مختلف تھا۔ ہندوستانی حکمران کو کبھی زمین کا واحد مالک نام نہیں کیا۔ اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس کے ماتحت یورپ کی طرح زمین کے مالکان کا ایک نیا سلسلہ ہو۔ جس کی آخری کڑی زرعی غلام پر جا کر ٹوٹ جائے۔ کاشتکار اور حکمران کے درمیان دلال یا بیچ کے بیوپاری تو موجود تھے۔ لیکن وہ یورپی نوابوں کی طرح زمین کے مالک نہ تھے۔ ان کا تو صرف یہ کام تھا۔ کہ مالیہ اکٹھا کر کے حکمران کے پاس پہنچا دیں۔ اگر کوئی جھگڑا کاشتکاروں اور ریاست میں اٹھ کھڑا ہوتا۔ تو اس کی زمین اس جھگڑے کے نتیجوں سے محفوظ تھی۔ جھگڑا کبھی زمین کے لئے نہ ہوتا تھا۔ چونکہ وادئی گنگا میں زرخیز زمینوں کی کمی نہ تھی۔ جھگڑا ہمیشہ اس بات پر ہوتا کہ کسان پیداوار کا کتنا حصہ حکمران کو ادا کرے۔

دیہاتی سماج حکمرانوں کی مٹھ بھیڑ سے آزاد تھا۔ بادشاہ اور بڑے بڑے تلوار کے دھنی آپس میں لڑتے تھے۔ ان کی لڑائی اس لئے ہوتی تھی۔ کہ وہ زمین پر قبضہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ تو مالیہ حاصل کرنے کا حق لینے کے لئے لڑتے تھے۔ لڑائی ہمیشہ تلوار کے دعویداروں کے درمیان ہوتی تھی۔ کسان خاموش ان کا تماشہ دیکھتا۔ جو جیت جاتا وہ اسے مالیہ ادا کر دیتا اور اصل مالیہ حاصل کرنے کا حق جیتنے والے کو مال غنیمت کے طور پر ہاتھ لگتا۔ ہم ایسے جاگیردارانہ نظام کا یورپ کے جاگیردارانہ

نظام سے مقابلہ کریں تو بھاری فرق نظر آتا ہے۔ یورپ میں زمین پر بادشاہ کو کلی اور تمام حق حاصل ہوتے تھے۔ وہ سلطنت کی تمام زمین کا مطلق مالک تصور کیا جاتا۔ پھر وہ اپنا حق نوابوں کو تفویض کر دیتا۔ نواب آگے زمین مضارعوں کو چند شرائط پر تقسیم کر دیتے۔ اور پھر مضارعے اپنے مضارعوں کو۔ اصل مالک یہیں تو بادشاہ ہوتا۔ اس کے برعکس ہندوستان حکمران کو صرف حق مالیہ حاصل ہوتا تھا۔ اس بات کو کھول کر اس لئے بیان کر دیا گیا ہے۔ کہ انگریز حکمرانوں نے دانستہ طور پر یا نادانستہ طور پر جو نظام زمین ہندوستان میں رائج کیا۔ وہ روایات کے بالکل برعکس اور یورپی نمونہ کا نظام تھا۔ جس نے مالکان اراضی زمین کو حق ملکیت سے محروم کر دیا۔ اور بیچ کے دلالوں کو زمین پر حکمران بنا دیا۔

انگریزی راج کی اور برکتیں۔

انگریزوں کے ہندوستان میں آنے سے دیہاتی زندگی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے عہد حکومت تک تو یہ حالت رہی کہ ٹیکس ادا کرنے کے سوا گاؤں ہر بات میں آزاد تھے۔ لیکن کمپنی کا راج قائم ہوتے ہی دنیا بدلنے لگی۔ اس سے پہلے ہندوستان بیرونی لوگوں کا غلام رہا۔ نئے سے نئے حملہ آور اسے مغلوب کرتے رہے۔ اور سینکڑوں سال انہوں نے راج بھی کیا۔ ہاں یہ بھی درست ہے کہ بعض اوقات تو یکے بعد دیگرے حملہ آوروں پر حملہ آور ہندوستان پر باز کی طرح جھپٹتے رہے۔ اور انہوں نے جی بھر کر ملک لوٹا۔ لیکن اس کی ہری کھیتیاں ہمیشہ لہلہاتی رہیں۔ ہندوستان کی اصل دولت اس کی رنگ برنگی آب و ہوا اور زمین کے سینہ میں چھپی ہوئی زرخیزی تھی۔ حملہ آور اوپر ہی اوپر دولت لیکر چلتے ہوئے۔ ہندوستان کا کچھ نہ بگڑ سکا۔

اب نئے حکمرانوں کی داستان سنئے۔ کمپنی نے ہمارے دیہاتی سماج کے

درخت کو جڑوں سے اکھیڑ پھینکا انگریزوں نے ہمارے سماجی ڈھانچے کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا - کہ اب تک اس کی تعمیر کے نہ تو کوئی آثار دکھائی دیتے ہیں - اور نہ ہی اس کی مرمت ہو سکتی ہے - یہ فلسفہ کی بھول بھلیاں نہیں بات سیدھی سادھی ہے - ہمارے دیہاتی سماج کی تعمیر صنعتی اور زرعی پیشوں کے گھریلو اتحاد پر ہوئی تھی - کھڈیاں چرخے کی بنیادیں تھیں - جن پہ پرانے ہندوستانی سماج کا ڈھانچہ کھڑا تھا - انگریزی لٹیروں نے دیسی کھڈیاں تباہ کر دیں - اور چرخے تباہ کر دئے - اس طرح ہمارے ملک میں ایک ایسا مجلسی (سماجک) انقلاب برپا ہوا - جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں ملنا مشکل ہے -

یہ ہوا کیسے یہ کہانی بھی دلچسپی سے خالی نہیں - انگریزوں کے ہندوستان میں آنے پہ پرانے جاگیر دارانہ نظام کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں - انیسویں صدی کے شروع میں مغل سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی - اور ہندوستان کے چاروں طرف بدنظمی کا غبار چھایا ہوا تھا - ہندوستان اپنی صنعت کے لئے دنیا بھر میں مشہور تھا - اور ہمارے شہروں میں اعلیٰ اعلیٰ قسم کا اونی سوتی ریشمی کپڑا تیار ہوتا تھا - لاکھوں عورتیں دھاگہ کاتنے میں مشغول رہتیں - اول اول تو انگریز یہ کپڑا یورپ میں لے جا کر بیچتے رہے - جس سے ہندوستان کو خوب منافع حاصل ہوا - لیکن انگلستان کے کارخانہ دار دستکاروں نے اس بات کو پسند نہ کیا - انہوں نے اس بات پہ زور دیا - کہ انگلستان میں آنے والی ہندوستانی چیزوں پہ ٹیکس لگایا جائے - حکومت نے یہ بات تسلیم کر لی ٹیکس لگانے کے علاوہ کچھ چیزیں تو انگلستان میں آنا بند ہی کر دی گئیں - پھر بھی اس کا ہندوستانی دستکاری پہ کچھ اثر نہ ہوا - اگرچہ انگلستان میں ہندوستانی مال پہ ۸۰ فیصدی ٹیکس لگایا گیا - اس کے باوجود ہمارا مال انگلستان میں سستے داموں بکتا رہا - انیسویں صدی کے آغاز تک یہی حالت رہی - اس کے بعد ہندوستانی دستکاری کو انگریزوں نے زبردستی ختم کرنا شروع کیا - انیسویں صدی کے آغاز میں انگلستان میں مشین چلنے لگی تھی

ہاتھ کی دستکاری مشین کا کیا مقابلہ کرتی۔ ہم بھی آزاد ہوتے تو بدلتے حالات کے مطابق مشین سے فائدہ اٹھاتے۔ اور ہمارا پلڑا دنیا کی منڈیوں میں ہمیشہ بھاری رہتا۔ لیکن انگریز حکمران اول تو ہماری پرانی دستکاری کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اب مشینوں کا پیٹ بھرنے کے لئے خام مال کی ضرورت تھی۔ ہندوستان صنعتی ملک کی بجائے پیداکار ملک بن گیا۔

یہ تبدیلی ہندوستانی سماج کے لئے مہلک ثابت ہوئی برطانوی کپڑے کی ہندوستان میں آمد نے ہمارے دستکاری نظام کو بالکل موت کی نیند سلادیا۔ چھوٹی چھوٹی صنعتوں میں لاکھوں لوگ کام کرتے تھے۔ یا یہ کہئے کہ ہماری زراعت اور صنعت کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ دستکاری کے خاتمہ سے ہمارے سماج پر نہایت مہلک اثر پڑا۔ جو لوگ صرف دستکاری پر گزارا کرتے تھے۔ کام نہ ملنے کی بنا پر گاؤں کی طرف بھاگے۔ اور اپنے بھائی بند کسانوں کے ساتھ کھیتی باڑی کا کام کرنے لگے۔ اس سے کھیتی باڑی پر بہت بوجھ آپڑا۔ اسی پر اکتفا نہیں۔ ہندوستانی صنعت کی زراعت سے جداگانہ ہستی نہ تھی۔ کسان مرد اور عورتیں اپنا بیکار وقت سوت کاتنے یا چھوٹی موٹی دستکاری پر صرف کرتے تھے۔ اب وہ بھی سال میں چھ سات ماہ بیکار رہنے لگے۔ بات مختصر یہ کہ اس معمولی انقلابی جھٹکے نے دستکاروں کو بیکار کر دیا۔ کسانوں کے پاس فالتو وقت میں کرنے کو کچھ کام نہ رہا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان سب چیزوں سے کھیتی کے سر پر اتنا بار آپڑا۔ جسے وہ اٹھانے کی متحمل نہ تھی۔ دیہاتی سماج کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور لوگ بھوکوں مرنے لگے۔

بھوک تو ہندوستان نے پہلے بھی کئی بار محسوس کی تھی۔ لیکن یہ انوکھی قسم کی نرالی بھوک تھی۔ اپنی تاریخ میں قحط راہیوں کی مثالیں ملتی ہیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ دیہات ہر اعتبار سے بذات خود مکمل ریاست تھے۔ ذرائع آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس لئے قحط کے زمانے میں غلہ اتنی جلدی ایک جگہ سے

دوسری جگہ نہیں پہنچایا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ آج ممکن ہے۔ اس لئے قحط سالی میں بھوک کا احساس ہونا ضروری تھا۔ لیکن اب تو غلہ کے جیتے جاں لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ ان کے گھروں میں غلے کے ڈھیر موجود ہوتے۔ مگر پھر بھی بھوک اور غریبی سامنے دکھائی دیتی۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب پرانا دیہاتی نظام تباہ کر دیا گیا۔ تو اس کی جگہ خود بخود ایک نیا سسٹم پیدا ہونے لگا۔ انگریزوں کو اپنی مشینوں کا پیٹ بھرنے کے لئے خام اجناس کی ضرورت تھی۔ انہوں نے اجناس سستے داموں حاصل کرنے کے لئے سڑکیں اور ملیں تعمیر کیں۔ ہندوستان میں ہی نہیں دنیا بھر میں ذرائع آمد و رفت وقتی ضروریات کو پورا کرنے کی خاطر درست کئے جا رہے تھے۔ دنیا میں جوں جوں ذرائع آمد و رفت بڑھے۔ ان میں زیادہ تعلقات پیدا ہونے لگے۔ اس طرح متحدہ امریکہ اور کینیڈا میں گندم و کپاس کے نرخوں کا اثر ہندوستانی اشیا کے نرخوں پہ پڑنے لگا۔ بات صاف یہ ہے۔ پہلے ہم گندم اور کپاس اپنی ضروریات کے لئے پیدا کیا کرتے تھے۔ اب یہ چیزیں دوسرے ممالک کی منڈیوں میں کھپت کے لئے تیار کی جانے لگیں۔ ہمارا کسان عالمگیر منڈی کے بھنور میں پھنس گیا۔ اس کی حالت دن بدن بگڑنے لگی۔ لیکن اسے پتہ نہ چلتا کہ اس کا سبب کیا ہے۔

یہ اٹکل پچو باتیں نہیں۔ اور نہ ہی ہمارا مقصد انگریزی راج کے عیب نکالنا ہے۔ ہم کسی کو برا بھلا نہیں کہنا چاہتے۔ یہ تو ہندوستان کی بالکل صاف کھلی و تاریخی باتیں ہیں۔ لیجئے ہم اقتصادی داناؤں کی نپی تلی باتوں سے اپنی بات کو ثابت کئے دیتے ہیں۔ اقتصادی ماہرین کی رائے ہے کہ ۱۸۵۰ء تک ہندوستان میں صرف کپڑے بننے کے کام میں برطانیہ کی آبادی کا آٹھواں حصہ لگا ہوا تھا۔ اب ذرا اعداد شمار دیکھئے ۱۸۱۸ سے ۱۸۳۶ تک ہندوستان میں برطانیہ سے آنے والے کپڑے کی درآمد ایک سے ۵۲۰۰ ہو گئی۔

اس قلیل عرصے میں اس کثیر اضافہ کا جو اثر دنیا بھر میں کپڑے کے لئے مشہور شہر
ڈھاکہ پر ہوا وہ بھی سن لیجئے۔ ڈھاکہ کی آبادی جو ڈیڑھ لاکھ افراد پر مشتمل تھی گھٹ کر بیس
ہزار رہ گئی۔ ایسا ہونا ضروری تھا۔ لوگ شوق سے تو کہیں رہتے نہیں۔ جہاں کسی کا کارو
بار ہوتا ہے وہیں وہ آباد ہو جاتا ہے۔ جب شہروں میں دستکاری فنا ہو گئی۔ تو
لوگ دیہاتوں میں بسنے لگے۔

یہ بن بلائے مہمان دیہات میں پہنچے تو دیہاتی نظام میں کھلبلی مچ گئی
زمین پر بوجھ بڑھ گیا۔ زمین پر بوجھ بڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین کو اتنے افراد
کی روزی مہیا کرنی پڑی ہے۔ جو اس کی ہمت سے باہر ہوتی ہے۔ اور یہ کہ قابل
زراعت زمین کی نسبت میں مسلسل کمی واقع ہوتی جاتی ہے۔ کاشت کرنے والوں اور
اور کاشت پر گزارہ کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ عمل انگریزی راج
کی ابتداء سے آج تک جاری ہے۔ اور اس کے نتائج بھی ہم سے چھپے نہیں۔

۱۸۸۱ء تک تو ہمارے دیس کی یہ حالت تھی کہ ایک سو سے صرف ۵۸ آدمی
کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے۔ لیکن ۱۹۲۱ء تک چالیس سالوں کے عرصہ میں ہی انقلاب
برپا ہو گیا۔ اب سو سے ۷۳ آدمی زمین پر کام کرنے لگے۔ ایک اور طرح اسی چیز کو
یوں بیان کیا گیا ہے۔ کہ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۱ء کے درمیان صرف ۲۰ سالوں میں
دستکاری کا کام کرنے والے لوگوں کی تعداد میں بیس لاکھ افراد کی کمی واقع ہوئی۔
ان اعداد و شمار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ انگریزی راج کے دوران میں کتنے لوگ
دستکاری کا کام چھوڑ کر گاؤں میں کھیتی باڑی کرنے لگ گئے ہیں۔ مگر ہم اندازہ
کیوں لگائیں۔ اقتصادی علم میں قیاس آرائیوں کا کیا کام۔ یہاں تو ٹھوس باتیں
ہی کام دے سکتی ہیں۔

لو ہم ایک اور مثال پیش کئے دیتے ہیں۔ بہار اڑیسہ کے لوگوں کا زیادہ تر

ذریعہ معاش زراعت ہے۔ وہاں ۱۱-۱۹۲۱ کے دس سالوں میں ۱۱ فیصدی آبادی کا اضافہ ہؤا۔ رقبہ کاشت اتنے کا اتنا رہا۔ اور پیداوار میں کبھی کوئی اضافہ نہ ہؤا۔ دور کیوں جایئے۔ خود ہمارے اپنے صوبہ کی یہی کیفیت ہے۔ سنہ ۳۱-۱۹۲۱ء میں پنجاب کی کل آبادی میں ۱۴ فی صدی کا اضافہ ہؤا۔ اور کاشتکاروں کی گنتی میں تقریباً ۲۰ فی صدی روزی کمانے کے وسیلوں میں کوئی اضافہ نہ ہؤا۔ یہی حالت بمبئی صوبہ سرحد آگرہ و اودھ مدراس الغرض تقریباً تمام ملک کی ہے

زمین پر آبادی کا بوجھ انگریزی راج کی پہلی برکت ہے۔ اول اول تو یہ عمل اس طرح شروع ہؤا۔ کہ صنعت کار افراد بیکار ہو کر گاؤں کی طرف بھاگے اور کھیتی باڑی کے کام میں مشغول ہو گئے۔ گھریلو دستکاری کی تباہی سے کاشتکار بذات خود سال میں چھ سات ماہ بیکار ہو گیا۔ افسوس اس بات کا نہیں۔ کہ پرانا دیہاتی نظام کیوں ختم ہؤا۔ اسے تو ختم ہونا ہی تھا۔ چونکہ وہ اپنا کام ادا کر چکا تھا۔ نئی دنیا میں اب جو زندگی اٹھان لے رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ چلنے کے قابل نہ تھا۔ قابل افسوس یہ امر ہے۔ کہ اس کی جگہ کوئی نظام نیا تعمیر نہ کیا گیا۔ پرانے مکان تو بوسیدہ سمجھ کر گرا دئے گئے۔ لیکن نئے تعمیر نہ کئے گئے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ انہیں کھڑا ہی رہنے دیا جاتا۔ ان کے گرانے سے اب عمل نے یہ شکل اختیار کر لی ہے۔ کہ آبادی بڑھ رہی ہے۔ نئے ذرایع معاش پیدا نہیں ہو رہے۔ کاشتکاروں کی زمین میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ وہ کھیتی کر کے بمشکل پیٹ بھر رہے ہیں۔ اور عام طور پر مقروض ہوئے جاتے ہیں۔

انگریزی راج کی دوسری برکت

انگریز ہندوستان میں تجارت کرنے آئے تھے تجارت کرتے کرتے بادشاہ بن بیٹھے ۱۷۶۴-۱۷۶۵ء میں کمپنی بنگال کی دیوان مقرر کی گئی

ہندوستان کی تاریخ میں اس طرح اجنبیوں کو ایسے حق حاصل ہونا کوئی عجب
بات نہیں۔ دیوان کا مطلب مرکزی طاقت سے ایک مقرر علاقہ سے مالیہ وصول
کرنے کا حق تھا۔ مالیہ اکٹھا کرنا کوئی خاص بات نہیں۔ مالیہ ہندوستانی
حکومتیں صدیوں سے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ وصول کرتی رہی ہیں۔ عجیب
بات تو وہ نظام ہے۔ جو انہوں نے مالیہ اکٹھا کرنے کے لئے زمین میں رائج
کیا۔ یہ نظام لانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ یہ کہانی بھی سن لیجئے۔

کمپنی کے آفسر اور دوسرے کارندے ازبس لالچی انسان تھے۔ ان
کے دل انسانیت اور انصاف کے خیالوں سے بالکل خالی تھے۔ انہوں نے
بنگال کا خزانہ بالکل خالی کر دیا۔ اب غریب کسانوں کی باری آئی۔ کمپنی نے
مالیہ اکٹھا کرنے کے لئے چھوٹے چھوٹے کارندے مقرر کئے۔ ان کارندوں
نے جی بھر کر لوگوں کو لوٹنا شروع کیا۔ مالیہ دگنا کر دیا گیا۔ جو بروقت ادائیگی
نہ کر سکتا زمین سے بیدخل کر دیا جاتا۔ مالیہ وصول کرنے والے کارندے ایک
قسم کے دلال یا ٹھیکیدار تھے۔ اور جنہوں نے ایک خاص مقررہ رقم پر ایک
خاص علاقہ سے مالیہ اکٹھا کرنے کا ٹھیکہ لیا ہوتا۔ نہایت بیرحمی سے لوگوں کو
لوٹتے۔ اور ان کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیتے۔

انگریزی راج سے پہلے بھی ایسے مالیہ اکٹھا کرنے والے
موجود تھے۔ لیکن تب لوٹ کھسوٹ نہ ہوتی تھی۔ ہندو بادشاہوں کے ماتحت پیداوار کسان
میں بادشاہ کا حصہ $\frac{1}{6}$ سے $\frac{1}{12}$ تک تھا۔ البتہ جنگ کے زمانہ میں اسے بڑھا کر
$\frac{1}{4}$ کر دیا جاتا تھا۔ مغل بادشاہوں نے اس حصہ کو بڑھا کر $\frac{1}{3}$ کر دیا۔ لیکن
انگریز کسی حد بندی کے اندر نہ رہ سکے۔ ان کا مقصد تو ہندوستان کو لوٹ
کر اپنا اور کمپنی کے مالکوں کا پیٹ بھرنا تھا۔ بنگال میں مغل کارندوں نے اپنے

راج کے آخری ۶۵-۱۷۶۴ سال جو مالیہ وصول کیا وہ ۸۱۸۰۰۰ پونڈ تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے راج کے پہلے سال ہی ۱۴۷۰۰۰۰ پونڈ وصول کیا۔ ۱۷۹۳ء میں بندوبست دوامی رائج کرنے کے وقت یہ رقم ۳۰۹۲۰۰۰ تک پہنچ چکی تھی یہ تو مالیہ کی باقاعدہ رقم ہے۔ کارندوں کی لوٹ کھسوٹ اس میں شامل نہیں ۔

اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ دیوانی ملنے کے چار سال کے اندر اندر بارش نہ ہونے اور کمپنی کی اس پالیسی کی بدولت بنگال اور بہار میں اسس غضب کا قحط پڑا۔ کہ تمام آبادی کے تیسرے حصے کا صفایا ہو گیا۔ اس قحط میں کمپنی کے کارندوں کی کارکردگی قابلِ تعریف ہے۔ لوگ بھوک کے ہاتھوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے تھے۔ لیکن انہیں مردوں سے ٹیکس وصول کرنے کی فکر دامنگیر تھی۔ تاکہ انگلستان میں کمپنی کے امیر مالکوں کو نفع ادا کیا جا سکے۔

اس طرح حالات بہت بُری شکل اختیار کرتے رہے۔ بائیس سالوں تک یہی کیفیت رہی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی بے دریغ کسانوں سے روپے ٹھونتی رہی اور بنگال کا خوبصورت صوبہ ویرانہ بن گیا۔ کسانوں کا تو کیا کہنا۔ بڑے بڑے زمیندار بھی بھیک کے محتاج ہو گئے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ غریب کاشتکاروں کی کیا حالت ہو گی۔ اور تو اور لارڈ کارنوالس کو خود تسلیم کرنا پڑا کہ ہندوستان میں کھیتی باڑی کا جنازہ اُٹھ چکا ہے۔ کسانوں اور زمینداروں کی حالت قابلِ رحم ہے۔

عین ممکن ہے لارڈ کارنوالس کو بھی کسانوں کی قابلِ رحم حالت کا علم نہ ہوتا۔ اگر کمپنی کا پیٹ لوگوں کی لوٹ سے بدستور بھرتا رہتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ مالیہ اکٹھا کرنے والے دلال ٹھیکہ پر زمین کو اٹھا لیتے لیکن وہ پہلے کی طرح مالیہ ادا نہ کر سکتے اس لئے وہ بیچ میں

ہی کام چھوڑ کر بھاگ جاتے مسلسل قرقیوں اور بیدخلیوں سے کسانوں کی حالت اس قدر دگر گوں ہو چکی تھی۔ کہ اب ان سے کچھ اور وصول کرنا ناممکن تھا۔ اس مشکل کا حل یہ نکالا گیا کہ کمپنی نے ۱۷۹۳ء میں دلالوں سے دس سال کا ٹھیکہ کیا جو بعد ازاں پکا کر دیا گیا۔ اسے ہندوستان کی تاریخ میں دوامی بندوبست کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کی رو سے مالیہ کی رقم ہمیشہ کے لئے مقرر کر دی گئی۔ مالیہ وصول کرنے والے زمیندار جہ مالوں سے بری قرار دئے گئے۔ اور انہیں حکومت سے اجازت لئے بغیر زمین فروخت کرنے کا حق حاصل ہو گیا۔

مشکلات کا یہ حل انگریزوں کے حق میں تو بہت مفید رہا۔ لیکن اس حل نے ہندوستان کے زرعی نظام کو جڑوں سے اکھیڑ پھینکا۔ نئے نظام نے کاشتکار مالکان اراضی کو مزارع بنا دیا۔ اور بیچ کے دلالوں یا ٹھیکہ داروں کو زمین کا مالک کمپنی کے راج سے پہلے بھی ایسے دلال موجود تھے۔ لیکن ان کا کام صرف مالیہ اکٹھا کرنا ہوتا تھا۔ اس وقت کے زمیندار یا تو ٹیکس ادا کرنے والے زمیندار تھے یا حکمران کے نامزدہ افسران جن کا کام کمیشن پر مالیہ اکٹھا کرنا ہوتا تھا۔ جو مستقل طور پر زمیندار مقرر کئے جاتے ان کا کام بھی حکومت کو ایک مقررہ رقم ادا کرنا ہوتا تھا۔ جو حاصل کئے گئے مالیہ کا $\frac{1}{2}$ ہوتی تھی۔ یعنی مستقل زمینداری کا مطلب یہ تھا۔ کہ زمیندار وصول کردہ مالیہ سے $\frac{1}{11}$ کا حقدار ہے۔

نیا نظام اراضی لارڈ کارنوالس نے انگریزی نمونہ پر قائم کیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ نظام اراضی نافذ کرتے وقت لارڈ کارنوالس ہندوستانی روایات سے واقف نہ تھا اس لئے اس نے جو نظام نافذ کیا انگریزی نمونہ پہ تھا۔ یہ بات درست نہیں لارڈ کارنوالس خود تسلیم کرتا ہے۔ کہ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ کہ وہ اس نظام سے ایک نئے طبقہ کو پیدا کر رہا ہے۔ اور ایسے حقوق پیدا کر رہا ہے۔ جو اس سے پیشتر زمینداروں کو حاصل نہیں۔

اس نظام سے انگریزوں کو بہت سے فائدے حاصل ہوئے۔ کمپنی مالیہ وصول کرنے کے نت نئے خطروں سے محفوظ ہو گئی۔ زمینداروں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی جنکے لئے انگریزی راج کی مضبوطی انگریزوں سے زیادہ عزیز تھی۔ ان وفاداروں نے صحیح میں حکومت کو ریڑھ کی ہڈی کا کام دیا۔ انگریز انقلابی خطرات سے محفوظ ہو گئے اور انہیں ایک جماعت کی حمایت حاصل ہو گئی۔ جو کسی صورت میں بھی ان کے خلاف کوئی بات نہ کر سکتی تھی۔

اس کے برعکس غریب کاشتکار مالکان اراضی سے مزارعے بن گئے انگریزی راج سے پہلے حکومت کا حصہ سالانہ پیداوار کا حصہ ہوتا تھا جو سالانہ پیداوار کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ بڑھتا گھٹتا رہتا تھا۔ اب اس کی جگہ ایک مقررہ نقد رقم نے لے لی۔ کسان بےرحم زمینداروں کے رحم پر چھوڑ دیئے گئے۔ جو انہیں ادائیگی نہ کر سکنے کے سبب زمین سے بیدخل کر سکتے تھے۔ ان زمینداروں کے ہاتھوں بیچارے کسانوں کی کیا حالت ہوئی یہ ہے ہماری اس کتاب کا اصل مضمون۔

ہم نے یہ تو کہہ دیا کہ انگریزی راج نے جو نظام زمین میں رائج کیا۔ اس نے کسانوں اور کاشتکاروں کو مفلس کر دیا۔ مگر آج روشنی کے زمانہ میں محض کہنے سے کون کسی کی بات مانتا ہے۔ تو ہم اعداد و شمار کی کسوٹی پر اس حقیقت کو پرکھتے ہیں۔ اگر کسی کسان کے پاس اتنا قطعہ زمین ہے جسکی آمدنی اس کے گزارا کیلئے ناکافی ہو۔ تو یقیناً وہ کاشتکار یا کسان غریب ہوگا۔۔ زمین کے ایسے قطعہ کو زمین کے ماہر غیر اقتصادی قطعے کے نام سے پکارتے ہیں۔ ایسے قطعے صرف ایک صوبہ میں ہی نہیں۔ بلکہ ہندوستان بھر میں بے حساب طور پر پائے جاتے ہیں ؛

ہندوستان کا کل رقبہ ۱۸ لاکھ مربع میل ہے جسمیں تقریباً ۱۱ لاکھ مربع میل انگریزی راج میں شامل ہے۔ لیکن تمام رقبہ پر تو کاشت ہوتی نہیں۔ کہیں بڑے بڑے شہر اور قصبے آباد ہیں۔ کہیں اونچے اونچے پہاڑ کھڑے ہیں۔ اب خود زمین کی یہ حالت ہے کہ تمام قابل کاشت نہیں۔ نشیبی اور دلدار زمین میں کاشت نہیں ہوسکتی ۱۳ فیصدی پر لق و دق جنگل کھڑے ہیں۔ اس وقت صرف ۲۵۰ ملین ایکڑ یعنی تیئس کروڑ بیس لاکھ ایکڑ زمین پر کاشت ہوتی ہے۔ یہ زمین کل رقبہ کا ۳۵ فیصدی ہے ۲۳ فیصدی زمین ابھی ایسی موجود ہے جس پر کاشت ہوسکتی ہے۔ لیکن وہ ابھی زیر کاشت نہیں لائی گئی۔

یہ ۲۳ فیصدی زمین زیر کاشت کا $\frac{2}{3}$ دو تہائی حصہ ہے۔ آبپاشی کا انتظام ہو جائے تو اس کا ایک حصہ ہر طرح زیر کاشت لایا جا سکتا ہے۔ لیکن اصل بات یہ

ہے۔ کہ موجودہ کاشت اراضی بھی آبپاشی کے اعتبار سے توجہ کی محتاج ہے آبپاشی
ممکن نہ ہو تو فصلوں کا دارومدار بارش پر ہوگا۔ ہمارا کسان زیادہ تر مون سون کی ترنگ
پر زندہ ہے ہندوستان میں بارش سال میں اوسطاً ۳۱″ ہوتی ہے۔ یہ پانی زیادہ نہ
سہی گزارا کے لئے کافی ہے۔ لیکن زیادہ تو یوں ہی بیکار بہ جاتا ہے۔ زمانہ قدیم سے
مصنوعی آبپاشی کے ذریعہ کام چلایا جا رہا ہے۔ کہیں کہیں پرانے زمانہ کے بڑے بڑے
بند اور نہریں بھی موجود ہیں اور ہزاروں تالاب اور کنویں۔ مگر ایک عرصہ تک ان کی
طرف کوئی توجہ نہ دی گئی اس لئے زیادہ تر اس قدر خراب ہو گئے۔ کہ بالکل استعمال
کے قابل نہ رہے۔ پچھلے پچاس پچپن سالوں سے ہماری سرکار آبپاشی کی طرف توجہ دے
رہی ہے۔ مگر ہماری سرکار کو رعایا کی نسبت اپنے مفاد زیادہ عزیز ہیں۔ نہریں صرف اُن
علاقوں میں نکالی گئی ہیں جو بر آمد کرتے ہیں۔ یہیں پر اکتفا نہیں۔ نہروں کو حکومت نے
آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ اقتصادی ماہروں نے اندازہ لگایا ہے۔ کہ ہمارے صوبہ
کی حکومت اپنے تمام خرچ نکال کر تقریباً دو کروڑ روپیہ سالانہ نہروں سے منافع حاصل
کرتی ہے۔ اب اور سنئے نہر صرف ایسے علاقہ میں نکالی جاتی ہے۔ جہاں وہ اس سرمایہ پر
چھ فیصدی منافع دینے کے قابل ہو۔ جو دس سال کے اندر اندر نہر کی تعمیر پر صرف کیا
گیا۔ اس کا نتیجہ یہ بر آمد ہوا کہ زیر کاشت آمدنی کا صرف پانچواں حصہ حکومت کی نئی
آبپاشی کی تجویزوں سے فائدہ اٹھا سکا ہے۔

زمین کی حالت خود زمین کی یہ حالت ہے کہ اس پر بادا آدم کے وقت سے ہل
چل رہا ہے۔ زرخیزی نام کو موجود نہیں۔ آبپاشی ناکافی ہے۔ یہ ہیں ہندوستانی کھیتی
کی خاص باتیں۔ ۱۹۲۸ میں ایک شاہی زراعتی کمیشن مقرر ہوا تھا۔ لارڈ لنلتھگو سابق
وائسرائے ہند اس کے صدر تھے۔ اس کمیشن نے زمین کے ماہرین کی رائیں سن کر یہ
کہا کہ ہندوستانی زمین کی زرخیزی میں جو کمی واقع ہوتی ہے قدرت اسے پورا کر دیتی

ہے۔ نئی زمین میں بیج بوؤ تو پہلے پہل پیداوار بہت اچھی ہو گی۔ پھر آہستہ آہستہ گھٹے گی اور گھٹ کر ایک حد تک ٹھہری ہو جائے گی ؎

زمین کی زرخیزی میں کمی کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ اسمیں کم مالیت کی پیداوار ہوتی ہے۔ ایک وقت تھا کہ ہم اپنی پیداوار کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور تھے ہندوستان سونے کی چڑیا تھا۔ اب وہ بھلے دن کہاں۔ دوسرے ملکوں نے سائنس سے کھیتی باڑی کو ترقی دی۔ امریکہ میں کروڑوں ایکڑ زمین سے کلر نکال کر اُسے قابل کاشت بنالیا گیا اسی طرح ساحل کے کنارے کروڑوں ایکڑ زمین پانی میں ڈوبی پڑی تھی۔ اُسے بھی مشینوں کے ذریعہ نکال کر ایک طرف پھینک دیا گیا۔ اب اس زمین پر کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ لوگ تو کھیتیاں مشین سے اُگاتے ہیں۔ مصنوعی کھاد سے پیداوار دگنی تگنی کر لیتے ہیں۔ مگر ہم ابھی تک لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ اس میں کسانوں کا کچھ قصور نہیں۔ وہاں یورپ اور امریکہ میں لوگوں کی اپنی حکومتیں ہیں۔ وہ لوگوں کے ہر کام میں دلچسپی لیتی ہیں۔ یہاں ہمارے سر پر غیروں کا راج ہے۔ ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔

انگلستان کی زمین ہماری زمین کا کیا مقابلہ کرے گی لیکن وہاں حکومت کو کسانوں کی بھلائی مقصود ہے۔ انگلستان ایک ایکڑ زمین ۲۲۵ روپیہ سالانہ کی پیداوار نکال دیتی ہے۔ ہماری اپنی کھیتی کا یہ حال ہے کہ یہاں ایک ایکڑ زمین سے بمشکل ۵۶ روپیہ سالانہ کی پیداوار ہوتی ہے۔ ہم چند ایک مثالوں سے بات صاف کئے دیتے ہیں۔ گندم کو لیجیے انگلستان کی ایک ایکڑ زمین ۲۰۰۰ پونڈ سالانہ پیدا کرتی ہے اور ہماری کھیتی اس کے مقابلہ میں ۶۹۰ پونڈ سالانہ۔ گنا ہندوستان میں دنیا بھر سے زیادہ پیدا ہوتا ہے لیکن اس کی پیداوار فی ایکڑ دوسرے ممالک سے بہت کم ہے۔ جاوا کی ایک ایکڑ زمین میں ۱۱۲۰ من گنا سالانہ پیدا ہوتا ہے جب کہ ہندوستان کی ایک ایکڑ زمین میں ۳۲۸۰ سالانہ۔ یہی کیفیت کپاس کی ہے کپاس مصر کی ایک ایکڑ زمین میں ۵۰۰ پونڈ سالانہ پیدا ہوتی ہے

امریکہ میں ۲۰۰ پونڈ سالانہ ہمارے کھیتی میں ۴۹ سیر فی ایکڑ سالانہ۔ اگرچہ کپاس کی پیداوار کے اعتبار سے ہندوستان دنیا میں دوسرے درجہ پر ہے۔

بعض عقلمند یہ کہتے ہیں کہ اس کا ذمہ دار کسان ہے۔ وہ زمین کو ابھی ابتدائی طریقوں سے ہی کاشت کرتا ہے۔ اور نئے اوزاروں سے بالکل واقف نہیں۔ وہ رسومات کا پابند ہے۔ توہمات میں الجھا ہوا ہے لیکن یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ دراصل ہماری زمین میں پیداوار کم ہونیکی وجہ یہ ہے کہ یہاں قدیم زمانوں سے کھیتوں میں کاشت ہو رہی ہے۔ زمین اپنی زرخیزی ختم کر چکی ہے۔ پنجاب میں فی ایکڑ زمین کی پیداوار اس لئے یو-پی سے زیادہ ہوتی ہے۔ کہ پنجاب میں بعض زمینوں کی کاشتکاری شروع ہوئے ابھی کم عرصہ ہوا ہے۔ حالانکہ پنجاب میں کاشتکاری کا طریقہ نسبتاً گھٹیا ہے۔ ایک اور سبب یہ ہے کہ زمین پر بوجھ زیادہ ہونے کی بنا پر کاشتکار کو مجبوراً گھٹیا قسم کی زمین میں کام کرنا پڑتا ہے اس سے اوپر پیداوار میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو یقیناً پیداوار زیادہ ہوتی۔

کسان ذمہ وار نہیں — رہا سوال ابتدائی طریقہ سے کاشت کا۔ تو اس کا کسان ذمہ وار نہیں۔ ان طریقوں کی جگہ نئے طریقے رائج کرنا حکومت کا کام ہے۔ باقی رہا کسان۔ تو وہ اتنا بیوقوف نہیں۔ جتنا درمیانہ طبقہ کے اعتراض کرنیوالے اسے قرار دیتے ہیں۔ شاہی زرعی کمیشن نے۔ ہندوستانی کاشتکاری کی کئی جگہ تعریف کی ہے اور اس کے کام کو سراہا ہے۔ جن حالات میں ایک عام کسان کام کرتا ہے۔ کسی ماہر زراعت کیلئے۔ ان میں مزید اصلاح تجویز کرنا معمولی چیز نہیں ہے۔ کمیشن کی رپورٹ میں کاشت کی عمدگی کے بہت

سے حوالے موجود ہیں۔ "اڑیسہ میں بہترین کاشت کی شہادت"، "گجراتی کسان کا اتنا ہی ماہر ہونا جتنا دنیا کا کوئی کسان ہو سکتا ہے۔" "دکن کے ماہر اور محنت کش کسان کی عمدگی کا اعتراف" کمیشن کی رپورٹ میں موجود ہے۔

پیداوار میں کمی کا یہ سبب نہ سمجھیئے کہ ہندوستان قدرتی ذرائع سے محروم ہے۔ اس کا اصل سبب کسانوں کی غربت ہے۔ جو انگریزی راج کی سب سے بڑی سوغات ہے۔ کسان اسقدر غریب ہے۔ کہ ان کے پاس کھوٹی کوڑی بھی فالتو نہیں بچتی۔ وہ زمین میں نئے اوزاروں اور کھاد سے متعلق کیونکر سوچ سکتا ہے۔ یہ کام تو صرف باہمی تنظیم اور سرکاری امداد سے سرانجام پا سکتا ہے تاکہ قوم کے زائد ذرائع کو اسطرح استعمال میں لایا جا سکے۔ کہ پیداوار میں ترقی ہو لیکن ہماری سرکار ایسی نہیں جو ایسی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا اپنا فرض سمجھتی ہو

زمین کے چھوٹے چھوٹے قطعے:- ان ٹھوس باتوں کو سامنے رکھ کر ہم کسان کو کس طرح قصوروار قرار دے سکتے ہیں۔ قابلیت اور تجربہ تو بزرگوں سے اسے ورثہ میں ملا ہے۔ وہ صدیوں سے زمین میں کاشت کر رہا ہے۔ اور یوں بھی اس کا طریقہ کاشت زمین اور آب و ہوا کے نہائیت مناسب اور موزوں ہے مگر آج وہ زمیندار نہیں رہا۔ اس کی حیثیت ایک چھوٹے سے قطعہ زمین کے مالک کی رہ گئی ہے۔ ایک وقت تھا کہ ہندوستان میں ہر ایک کسان کے پاس اوسطاً چالیس ایکڑ زمین تھی۔ یہ ۱۷۷۱ کی بات ہے ۱۸۱۸ میں یہ اوسط فی کسان ½۱۷ ایکڑ رہ گئی ۱۸۴۰ میں ۱۴ ایکڑ ہوئی اور پھر ۱۵-۱۹۱۴ تک گرتے گرتے ۷ ایکڑ تک آ پہنچی۔ اور آج یہ حالت ہے کہ ہر کسان کے پاس صرف ½۲ ایکڑ زمین نظر آتی ہے۔

ان اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ پچھلے ساٹھ یا ستر سالوں کے عرصہ میں

زمین کے قطعوں کی حالت ہی بدل چکی ہے۔ قطعوں کی بذات خود یہ حالت ہے کہ ان میں ۸۱ فیصدی نہایت موافق حالات میں مالکان کی روزی مہیا کرنے کے قابل نہیں۔

آؤ اب تمام صوبوں کی یکے بعد دیگرے سیر کریں۔ کسانوں کی حالت ہر جگہ دگرگوں ہے۔ لیجیئے ۱۹۲۱ کی رپورٹ مردم شماری نے یہ نقشہ کھینچا ہے۔ دیکھے ہر صوبہ میں اوسطاً ایک کسان کے پاس کتنی زمین نکلتی ہے

بمبئی	۱۲٫۲ ایکڑ	برار اور سی پی	۸٫۵ ایکڑ
پنجاب	۹٫۲ "	بہار اور اڑیسہ	۳٫۱ "
مدراس	۴٫۹ "	بنگال	۳٫۱ "

بظاہر تو پنجاب اور بمبئی وغیرہ کی حالت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں بڑے بڑے زمینداروں کے پاس تو سینکڑوں ایکڑ اراضی موجود ہے اگر زمین کو تمام کسانوں پہ درجہ بدرجہ تقسیم کریں تو تمام کاشتکار ایسے ملیں گے جن کے پاس یا تو سرے سے زمین موجود ہی نہیں۔ اور اگر ہے بھی تو اتنی کم ہے کہ اس سے خاندان کا گزارا ہونا ممکن نہیں۔

آؤ بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ مسٹر ایچ کلیورٹ ۱۹۲۵ میں پنجاب کی انجمن ہائے امداد باہمی کے رجسٹرار تھے آپ نے ایک کتاب تقسیم زمین سے متعلق لکھی ہے۔ جس میں آپ نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں ۸۴٫۵ فیصدی مالکان اراضی کے پاس اوسطاً ۴ ایکڑ سے بھی کم زمین ہے جو کل زمین کا ۳۸٫۵ فیصدی حصہ ہے اور بقیہ ۱۵٫۵ مالکان کے پاس اس سے زیادہ۔ پتہ چلتا ہے کہ ۱۸ فیصدی مالکان کے پاس اوسطاً فی کس آدھ ایکڑ سے بھی کم زمین ہے اور ۵۰۰۰ مالکان کے پاس پورے دو ایکڑ فی کس۔

اب اپنے ضلع کی پڑتال کریں۔ پنجاب میں ۲۰۸۵ مالکوں کے ۷۱۵ ایکڑ

سے کم زمین ہے۔ کاشتکاروں کا حال اس سے بھی بدتر ہے۔ کل مالکوں میں سے
۹،۱۴ فیصدی ایک ایکڑ سے کم زمین کے مالک ہیں اور کاشتکاروں میں سے
۲۲½ ایکڑ یا اس سے کم زمین کاشت کرتے ہیں۔ بمبئی کو چھوڑ کر جہاں حالات
کافی حد تک پنجاب سے ملتے جلتے ہیں۔ دوسرے صوبوں کی حالت نہایت ناگفتہ بہ
ہے۔ تمام اراضی کا ایک چوتھائی ایک ایک ایکڑ سے بھی چھوٹے قطعوں میں تقسیم ہے
نصف پانچ پانچ ایکڑ اور تین چوتھائی دس دس ایکڑ کے قطعوں میں بٹا ہوا
ہے بنگال و بہار اور صوبجات متحدہ میں عام کسانوں کے پاس پانچ پانچ ٹینس کورٹ سے
زیادہ زمین نہیں دوسرے علاقوں کی بھی یہ ہی حالت ہے۔ عام کسانوں کے
پاس چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی ہیں اور چھوٹے بھی اسقدر کہ ان میں ہل
تک مڑنا مشکل ہے

یہ بدنصیبی کی انتہا نہیں۔ زرعی نظام اسقدر بگڑ چکا ہے کہ اسکی تعمیر کے کچھ
آثار دکھائی نہیں دیتے۔ ایک اور مصیبت یہ ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی کئی
حصوں میں بٹے ہوتے ہیں۔ فرض کرو ایک کسان چار ایکڑ زمین کا مالک ہے
اور اس کے چار بیٹے ہیں اس کی وفات پر یہ زمین چار حصوں میں مساوی طور
پر بانٹ لی جائے گی عام طور پر یہ چار ایکڑ بھی ایک جگہ نہیں ہوتے ایک ایکڑ
اچھی زمین ہے باقی تین ایکڑ گھٹیا قسم کی ہے۔ پہلا ایکڑ چار مساوی حصوں میں
بانٹ جائیگا۔ اسی طرح بقیہ تین ایکڑوں کی چیر پھاڑ ہو گی۔ زمین کی ایسی بانٹ
کا عمل جاری ہے اور جب تک موجودہ نظام موجود ہے جاری رہیگا۔

اس مشکل کا حل اشتمال اراضی میں تلاش کیا گیا ہے۔ ہر گاؤں میں زمینوں کو
ایک جگہ جوڑنے کی کوششیں کیا جاری ہیں لیکن یہ مرض کا علاج نہیں۔ زمین پر دباؤ
اسقدر زیادہ ہے کہ تقسیم در تقسیم کے عمل کو روکا نہیں جا سکتا۔ ایسا کرنے کیلئے

وراثت کے موجودہ قانون کو بدلنا پڑے گا۔ اس کے باوجود بھی مشکل حل نہ ہوگی
برما کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہاں زمین از روئے قانون بڑے لڑکے کو ورثہ
میں ملتی ہے۔ اور وہ دوسرے بھائیوں کو نقد روپیہ ادا کر دیتا ہے۔ تجربہ سے ثابت
ہوا ہے کہ اس سے کسانوں کی غربت میں اور بھی اضافہ ہوا ہے۔ کسانوں کی مشکل
اس وقت تک حل نہیں ہو سکتی جب تک ان کے پاس دس بارہ ایکڑ چاہی یا ۱۲-۱۴
ایکڑ نہری زمین نہ ہو۔ اس سے ایک کنبہ کا گزارہ ہو سکے گا۔ اگر حکومت ایسا نہیں
کر سکتی تو اسے زرعی نظام کو نئی سائنس کی بنیادوں پر کھڑا کرنا پڑے گا۔ لیکن اس
سے کسی بات کی امید رکھنا فضول ہے۔

ایک اور قباحت یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں جن کے کاشتکار زیادہ
ہوتے ہیں۔ زیادہ بیلوں کی ضرورت ہوتی ہے وجہ ظاہر ہے۔ کہ ہر کسان کو
بیلوں کی جوڑی چاہیئے بیلوں کی تعداد سب سے زیادہ بنگال میں ہے۔ وہاں
کھیت بھی سب سے چھوٹے ہیں۔ ہندوستان میں ۱۰۰ ایکڑوں میں کھیتی باڑی کے
لیئے ۶۷ بیلوں کی ضرورت ہے مصر میں کل ۲۵۔ اور ہالینڈ میں ۳۸ گائے بیلوں
کی نسل سدھارنے کیلئے ان کی تعداد گھٹانی ضروری ہے۔ مگر تعداد کیوں کر گھٹے۔
زمین کی تقسیم در تقسیم کاشتکاروں کی تعداد بڑھاتی ہے کاشتکاروں کی تعداد کے
ساتھ مویشیوں کی تعداد بڑھے گی۔ ہم ایک ایسے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں کہ نکلنا
مشکل ہے۔

آبادی کا بوجھ ہر جگہ پڑ رہا ہے آبادی نے واقعی ہمارے سامنے مشکل مسئلہ رکھ دیا ہے
آبادی جوں جوں بڑھتی ہے زمین پر بوجھ بھی بڑھتا جاتا ہے۔ آبادی کا بوجھ ہلکا
کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگ کسی دوسرے ملک میں جا کر آباد ہو جائیں ۳۱-۱۹۴۱ء
میں صوبجات متحدہ سے تقریباً پونے دس لاکھ افراد اور بہار اڑیسہ سے ۱۱ لاکھ ۶۸ ہزار

افراد دوسرے صوبوں میں مزدوری کو نکلے۔ اس سے تو مشکل حل نہ ہوئی۔ ایک جگہ کا بوجھ دوسری جگہ جا پڑا۔ البتہ اس کا ایک نتیجہ نکل سکتا ہے۔ کہ جو صوبے نسبتاً امیر ہیں۔ وہ بھی دوسروں کی طرح روٹی تک کے محتاج ہو جائیں۔ ہندوستان سے باہر آباد ہونے کے متعلق عرض ہے کہ متحدہ امریکہ یا افریقہ کہیں بھی ہندوستانیوں کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ اور تو اور انہیں حق شہریت تک نہیں دیے جاتے۔ متحدہ امریکہ میں ایک قانون پاس ہو رہا ہے جسکی رو سے تین ہزار ہندوستانی ہر سال امریکہ جا کر مزدوری کر سکیں گے۔ اس قانون کے پاس ہونیکے پانچ سال بعد عمل ہو گا۔ پھر بھی "یہ تین ہزار" ہندوستان کے ایسے پیچیدہ مسئلہ کا حل کیسے ہو سکتے ہیں؟ در اصل آبادی کا مسئلہ اتنا بڑا "ہوا" نہیں جتنا کہ اُسے عام طور پر دکھایا جاتا ہے۔ اس کا حل ہندوستان خود اپنے اندر تلاش کر سکتا ہے۔ یہ مسئلہ صرف ہمارا مسئلہ نہیں۔ آبادی تو تمام ملکوں کی برابر بڑھ رہی ہے ۱۸۹۱ء اور ۱۹۰۱ء کے درمیان انگلستان میں آبادی کے اضافہ کا تناسب ۱۲ ½ فیصدی اور ہندوستان میں ۲ فیصدی تھا۔ جرمنی۔ جاپان اور اٹلی کی آبادی ایک فیصدی فی سال کے حساب سے بڑھ رہی ہے۔ روس کی رفتار ۱ ½ فیصدی فی سال ہے۔ ۳۱-۱۹۲۱ کے درمیان ہماری آبادی کے بڑھنے کی رفتار ایک فیصدی فی سال سے ذرا تیز تھی

آؤ اب اس بات کا مطالع کریں کہ دوسرے ملکوں میں زمین پر کتنا بوجھ ہے فرانس میں ۵۱ فیصدی لوگوں کا دار و مدار زمین پر ہے کینیڈا میں ۴۶٫۷ فیصدی اور متحدہ امریکہ میں ۴۳٫۸ فیصدی زمین پر بوجھ تو ان ملکوں میں بھی کم نہیں لیکن ہماری بات ان سے مختلف ہے یورپی ملکوں کی یہ کیفیت ہے کہ ان میں جہاں آبادی کا اضافہ ہوا صنعت نے بھی ترقی کی بیکار آبادی کارخانوں اور فیکٹریوں میں کھپتی

رہی جرمنی میں ۱۸۷۰ اور ۱۹۱۴ کے درمیان صنعت نے ۲ کروڑ پچاس لاکھ دیہاتیوں کو کام دیا۔ اُس کے مقابلہ میں ہم ہیں ہماری صنعت ۱۹۱۴ء کے بعد جنگی ضرورتوں کے ماتحت پیدا ہوتی ہے اس سے پہلے یہ حالت تھی کہ برطانوی راج ہماری دستکاری کو تباہ کرنے میں مشغول رہا۔

صنعت و حرفت میں ترقی سے کسی حد تک آبادی کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ مشکل کا اصل حل نہیں ہو سکتا۔ ہمارا ملک ہمیشہ زراعتی ملک بنا رہےگا۔ یہ کبھی جرمنی یا انگلستان کیطرح خالص صنعتی ملک نہیں ہو سکتا۔ اقتصادی ماہروں نے اندازہ لگایا ہے کہ اگر ہماری تعداد اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو ۱۹۴۸ تک ہماری آبادی تنتالیس کروڑ ہو جائیگی۔ عین ممکن ہے۔ یہ اندازہ درست نکلتا اور اس کے غلط ثابت ہونیکی کوئی وجہ بھی نہیں البتہ جنگ نے ہماری کافی آبادی کا صفایا کردیا ہے۔ آبادی کے بوجھ گھٹانے کے اور کچھ حل چاہے نہ مل سکے لیکن انگریزی راج کی بدولت یہاں ایسی حالت پیدا ہوگئی ہے۔ کہ کبھی قحط سے اور کبھی بیماریوں سے کانٹ چھانٹ ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود بھی زمین پر آبادی کے بوجھ کا سوال حل نہیں ہوتا۔ چاہے کانٹ چھانٹ کتنی ہو جائے زمین پر آبادی کا بوجھ بدستور رہیگا

اس کا ایک حل نکل سکتا ہے۔ اگر ہم ایک ایکڑ زمین سے انگلستان کی طرح ۲۲۵ روپیہ کی سالانہ پیداوار حاصل کرنے لگیں۔ تو اسکا مطلب یہ ہے کہ تمام آبادی فی کس ۲۷۸ روپیہ سالانہ یا ۱۲ آنے فی کس فی یوم حاصل کر سکیگی۔ اسطرح پانچ افراد پر مشتمل ایک کنبہ کی روزانہ آمدنی تین روپیہ ۱۲ آنہ ہو جائے گی۔ بظاہر تو ایسا ہونیکی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی چونکہ ہمارا دیس زمین کی زرخیزی کے اعتبار سے کسی ملک سے پیچھے نہیں اور اس کے باشندے قابلیت میں انگلستان کے

لوگوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ لیکن اس کے لئے زراعت کو از سرِ نو نئی بنیادوں پر منظم کرنے کی ضرورت ہے زراعت بڑے پیمانہ پہ شروع کرنا ہوگی مشین اور مصنوعی کھاد سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔ یہ ایسی باتیں ہیں جن کی طرف ہماری سرکار توجہ دینے کے ناقابل ہے اور نہ ہی کوئی ایسی حکومت توجہ دے سکتی ہے۔ جس کے مفاد یہاں کی نسبت کسی اور ملک کی بہتری سے وابستہ ہوں
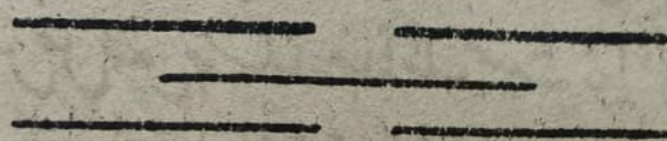
مصیبت پہ مصیبت

یہ نہ سمجھیے کہ کسان کی مصیبتیں یہیں پر ختم ہیں۔ ابھی تو ہم نے موٹی موٹی بنیادی باتیں بیان کی ہیں۔ زمین کی زرخیزی میں کمی اور اس کی تقسیم در تقسیم ہی کسان کی بڑی مشکل نہیں۔ اس کی مشکلات کا شمار کرنے لگیں تو داستان ختم نہ ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ اس تھوڑی بہت آمدنی میں بھی اس کے کئی حصہ دار ہیں آمدنی کا وہ اکیلا مالک نہیں لطف کی بات یہ ہے کہ یہ حصہ دار اس کے کام میں کوئی مدد نہیں دیتے۔ آؤ اس کی آمدنی پر پلنے والوں کا شمار کریں۔

مالیہ کے دوامی بندوبست کی تو پہلے باب میں کہانی بیان کی جا چکی ہے۔ یہ صرف بنگال و بہار پر نافذ کیا گیا ہے اس کے بعد جب انگریزی راج شمال مغرب کی طرف بڑھنے لگا۔ تو انگریزوں نے اپنی پرانی غلطی کو نہ دہرایا۔ ہندوستان میں انگریزی سلطنت کی بنیادیں مضبوط ہو چکی تھیں۔ اب سرکار پہلے کی طرح اپنے ہاتھ نہیں باندھ لینا چاہتی تھی۔ اس لیئے جو نیا طریقہ مالیہ اراضی سے متعلق رائج کیا گیا۔ اسمیں اضافے کی گنجائش رکھ لی گئی نئے نظام کے مطابق بندوبست عام طور پر تیس سال کے بعد ہونے لگا جب نیا بندوبست ہو گا۔ مالیہ میں اور اضافہ کر دیا جاتا۔

ماضی کی باتیں چھوڑیئے۔ آؤ آج کے ہندوستان کی سیر کریں۔ آج برطانوی ہندوستان میں تین قسم کے بندوبست اراضی موجود ہیں۔ اول دوامی بندوبست یہ بنگال بہار۔ اور شمالی مدراس کے چند اضلاع میں رائج ہے دویم عارضی زمینداری بندوبست یہ صوبجات متوسط صوبجات متحدہ بمبیی اور بنگال کے کچھ حصوں اور پنجاب میں رائج ہے تقریباً ۵۳ فیصدی زمین اسکے ماتحت آتی ہے۔ سویم۔ رعیت

داری طریقہ یہ بمبئی۔ زیادہ تر مدراس برار۔ سندھ۔ آسام اور دوسرے کئی علاقوں
میں رائج ہے تقریباً ۵۱ فیصدی اراضی اس کے ماتحت ہے۔
اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ زمیندار صرف ۴۹ فیصدی زمین پر نظر آتے
ہیں۔ دراصل مالک کاشتکاروں کا نت نئے بوجھوں تلے زمین ہاتھ سے کھو
بیٹھنے کا عمل بڑی تیزی سے جاری ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ خود مدراس میں
۳۵ فیصدی زمین پر مضارعے خود کاشت نہیں کرتے۔ زمین پر ٹھیکہ در ٹھیکہ کا نظام
قایم ہے۔ مدراس کی یہ حالت ہے۔ کہ وہاں خود کاشت نہ کرنیوالے مالکانِ زمین کی
تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے ۱۹۰۱ میں یہ تعداد ۱۹ ہزار تھی۔ ۱۹۲۱ میں ۲۲ ہزار
ہو گئی۔ یہ ہی کیفیت پنجاب کی ہے ۱۹۲۱ کی رپورٹ مردم شماری میں درج ہے
کہ پہلے یہاں خود نہ کاشت کرنیوالوں کی تعداد چھ لاکھ ۲۶ ہزار تھی۔ لیکن اب
وہ دس لاکھ آٹھ ہزار تک پہنچ گئی ہے چار لاکھ کا اضافہ معمولی اضافہ نہیں۔ صوبجات
متحدہ کی بھی سن لیجیئے وہاں ۱۸۹۱ء اور ۱۹۲۱ کے درمیان میں ایسے لوگوں کی
تعداد میں ۴۶ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ جو زرعی لگان پر پلتے ہیں۔ صوبجات متوسط
اور برار میں ۵۲ فیصدی اضافہ ہوا۔

دو قسم کے زمیندار اصل بات یہ ہے کہ زرعی آبادی ۷۰ فیصدی حصہ پر
اس وقت زمیندار مالکوں کا قبضہ ہے یہ زمیندار دو حصوں میں تقسیم کیئے
جا سکتے ہیں اول وہ زمیندار ہیں جنہیں دوامی بندوبست نے جنم دیا وہ
مالکان اراضی ہیں جنہوں نے پچھلی ایک صدی کے دوران میں یا تو خود اراضی
خرید کی یا دوسرے ذریعوں سے حاصل کر کے ان کے مالک بن بیٹھے۔ آج
زرعی آبادی کے ۳/۴ پر ۱/۴ زمینداروں کا قبضہ ہے۔ ہندوستان دراصل چھوٹے
چھوٹے کاشتکاروں کا ملک ہے۔ زیر کاشت زمین کے صرف چوتھے حصہ پر

مالک کاشتکار کھیتی باڑی کرتے ہیں اور براہ راست مالیہ ادا کرتے ہیں باقی زمیندار ی کے قبضہ میں ہے جس پر کھیتی باڑی مزارعوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔

مزارع:- اب مزارعوں کی سنیئے یہ لوگ ہندوستان میں سب سے زیادہ بد نصیب ہیں۔ ان سے جسقدر لگان وصول کیا جاتا ہے اسکی حد ہے نہ حساب بنگال میں زمیندار مزارعوں سے وصول کئے گئے لگان کے ۲۵ فیصدی سے بآسانی حکومت کا حصہ چکا دیتے ہیں۔ دیگر زمینداری علاقوں میں یہ تناسب کم ہے۔ بہار کے کچھ حصوں میں ۴۰ سے ۴۲ فیصدی تک ہے اور کبھی کبھی ۵۰ فیصدی بھی ہو جاتا ہے لیکن پنجاب میں ۲۷ قطعات اراضی کے سروے نے بنگال کو بھی مات کر دیا۔ پیداوار کا ۱۸ فیصدی تو اصل کاشتکاروں کے حصہ میں آیا باقی ۸۲ فیصدی پر زمیندار نے ہاتھ صاف کیا۔ طرہ یہ کہ زمیندار زمین میں بالکل دلچسپی نہیں لیتے۔ اور نہ ہی اس قسم کا بدل کسی صورت میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ جو زمیندار اپنے کارندوں کے ذریعہ کاشتکاروں سے وصول کرتے ہیں۔ مزارعوں کی مشکلات کم کرنے کیلئے کئی قانون پاس ہوئے لیکن عمل کی دنیا میں انہیں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی اور نہ ہی مزارعے ان سے کوئی فائدہ اٹھا سکے لگان کی شرح خون نچوڑنے والی حد تک زیادہ ہے اور بیدخلیاں روزمرہ کی معمولی بات بن چکی ہیں۔

مزارعوں کی جان لگان ادا کرنے سے نہیں چھوٹتی۔ متفرق ٹیکسوں کا نہ ختم ہونیوالا سلسلہ اس کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیتا ہے۔ بنگال کی یہ حالت ہے کہ مزارعوں سے بٹورے گئے متفرق ٹیکسوں کا اندازہ ۴۰ لاکھ پونڈ سے ۹۰ لاکھ پونڈ کے درمیان ہے۔ صوبجات متحدہ میں مزارعوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ مالک کے ہاتھی یا موٹر کار کا خرچ برداشت کریں کئی جائز متفرق میں زمیندار

کے خاندان میں شادی یا بیاہ ہو تو مزارع کو ایک من گندم ادا کرنا پڑتی ہے۔ نیز ہر فصل میں ایک روز زمیندار کی اراضی کاشت کرنا بھی ضروری ہے غیر کاشتکار لوگ بھی زمیندار کے ٹیکسوں سے جان نہیں بچا سکتے۔ انہیں بھی اپنا حصہ ادا کرنا پڑتا ہے آؤ مختصر طور پر زمیندار کے ٹیکسوں کا حساب کریں یہ ہیں موترانہ ہاتھیانہ پیدائش و موت کے ٹیکس۔ بکری ٹیکس۔ کھڑکی ٹیکس اور فصل ٹیکس وغیرہ۔ بیگار اس کے علاوہ ہے۔

آؤ اپنے گریبان میں ہم منہ ڈال کر اپنی حالت کا مطالعہ کریں ہمارا صوبہ کاشتکار مالکوں کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ زمین کا ۶۰ فیصدی مزارعوں سے کاشت کرایا جاتا ہے۔ لگان کہیں جنس اور کہیں رقم میں ادا کیا جاتا ہے اراضی بٹائی یا ونڈی پر براہ کاشت مزارعوں کو اٹھائی جاتی ہے۔ بٹائی یا ونڈی کل آمدنی کا وہ حصہ ہے جو مزارع زمیندار کو بطور لگان ادا کرتا ہے۔

نہری زمینوں میں زمیندار صرف زمین ہی دیتا ہے۔ باقی تمام چیزیں مزارعوں کو خود مہیا کرنا پڑتی ہیں مالیہ مزارع اور زمیندار مساوی طور پہ ادا کرتے ہیں۔ بیج۔ ہل۔ بیل مزارع اپنے پاس سے لاتا ہے اور کاشت کے تمام اخراجات بھی اُسے مہیا کرنا پڑتے ہیں۔ لیکن بٹائی سے پہلے۔ فصل کٹائی چھانٹ پھونک اور کمیوں کے خرچ مشترکہ فصل سے کاٹ لئے جاتے ہیں۔

بٹائی کی شرح مختلف علاقوں میں مختلف ہے۔ یہ مختلف ضلعوں میں ۱/۲ سے لے کر ۲/۳ تک ہے کہیں کہیں اس سے بھی اوپر چڑھ جاتی ہے۔

دیہاتوں کے کسان۔ انگریز جاگیرداروں کے ماتحت کام کرنے والے کاشتکاروں کی حالت سب سے ابتر ہے ابتدائی طور پر تو یورپی جاگیردار انیسویں صدی کے

دمط میں بنگال میں پیدا ہوئے پھر دوسرے صوبوں میں بھی بڑے بڑے قطعوں پر کاشت کرنے لگے۔ عام لفظوں میں ایسے قطعوں کو پلانٹ کے نام سے پکارا جاتا ہے یہ کھیت زیادہ تر چائے ربڑ اور کافی کے ہیں۔ یہاں کام کرنیوالوں کی حالت بالکل غلاموں کی سی ہے۔ ان کھیتوں میں کام کرنیوالے مزدور تمام ہندوستان سے بھرتی کیئے جاتے ہیں۔ مزدور ایک طرح سے تمام عمر کے لئے کمپنیوں سے بندھے ہوتے ہیں کام چھوڑ کر نہیں جا سکتے جن شرائط کے ماتحت انہیں کام پر مجبور کیا جاتا ہے۔ انکی نگرانی اس قدر کڑی ہوتی ہے کہ مزدور بھاگنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن قانون انہیں بھاگنے نہیں دیتا ان حالات سے تنگ آکر وہاں کئی بغاوتیں ہوئیں۔ بنگال میں تو مزدوروں نے ایک کمپنی کے تمام کارخانہ کو آگ لگا دی۔ آخر آل انڈیا کانگرس نے اس مسئلہ کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ اور کڑے قانون ذرا ڈھیلے کرائے پھر بھی کاشتکاروں کی حالت قابلِ رحم ہے

قرضہ:- کسان کی مشکلات کا آخری نتیجہ قرضہ ہے۔ اور قرضہ کا نتیجہ ہے اسکی بربادی۔ لیکن اس کے بغیر کچھ چارا بھی نہیں۔ قرضہ اور غربت دو لازم ملزوم چیزیں ہیں۔ وہ قرضہ اس لئے اٹھاتا ہے کہ وہ غریب ہے۔ غریب اس لئے ہے۔ کہ اس کے سر پر قرضہ کا بوجھ ہے۔ وہ اس ہوائی چکر میں بری طرح پھنسا ہوا ہے لیکن وہ کرے کیا۔ جوں جوں مصیبتیں بڑھتی ہیں قرضہ کا بوجھ بھی بھاری ہوتا جاتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ کوئی آدمی بھی ایک ایسے نظام کو جاری رکھنا پسند نہیں کرے گا جس میں ایک آدمی اس حالت میں پیدا ہوتا ہو کہ اس پر قرضہ کی بھاری رقم ہو اور وہ تمام عمر قرضہ ادا کرتا رہتا ہے۔ اور جب وہ مرے اپنی آنے والی نسل پر قرضہ کا بھاری بوجھ چھوڑ جائے۔

آج ہمارے صوبہ میں جب کسی کسان کے گھر اولاد پیدا ہوتی ہے تو پیدا

ہونے والے بچے کو دنیا میں سب سے پہلی نعمت جو ملتی ہے ۱۰۴ روپیہ کا قرضہ ہے
حیران کیوں ہوتے ہو سوچ بچار میں وقت ضایع کرنے کی ضرورت نہیں کہ قرضہ
اس کے سر پر کیسے آگیا۔ اس نے تو کھوٹی کوڑی تک کسی سے ادھار
نہیں لی۔ اس بدنصیب دیس میں ایسے اندھیر عجیب بات نہیں ہمارے
صوبہ کے ہر کسان پر جس میں بچے بوڑھے جوان سب شامل ہیں
۱۰۴ روپیہ قرضہ نکلتا ہے یہ اندازہ ۱۹۲۹ کا ہے ۱۹۲۱ میں یہ قرضہ
۷۴ روپیہ تھا مطلب یہ کہ قرضہ بڑھ رہا ہے۔ اگر اس قرضہ کو زیر کاشت
زمین پر پھیلا دیا جائے تو ہر ایکڑ ۱۴۶ روپیہ کا مقروض نکلے گا۔
۱۹۲۹ میں پنجاب کے کسان ۱۳۵ کروڑ روپیہ کے مقروض تھے اسکے
بعد قیمتیں گرنے لگیں ان کے سر پر یہ بوجھ اور بھی بھاری ہو گیا ۱۹۲۹ میں
۱۳۵ کروڑ ۱۹۳۵ میں ۲۰۰ کروڑ ہو گیا اور جنگ سے قبل یہ قرضہ بڑھتا رہا
البتہ جنگ نے پنجاب کے مالک کاشتکاروں کا بوجھ قدرے ہلکا کر دیا ہے۔ کچھ
لوگ تو بھرتی ہو کر فوج میں چلے گئے۔ باقی جو ہیں اجناس کے نرخ بڑھ جانے
سے خوش باش نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ خوشی عارضی خوشی ہے۔ جب تک
نظام اراضی میں بنیادی تبدیلیاں نہ ہوں کسان کی مشکلات کا ختم ہونا ممکن
نہیں۔ جنگ کے بعد سخت قسم کی کساد بازاری پیدا ہو گی۔ پھر کسان محسوس کریگا
کہ خوشی تو محض دھوکہ تھی۔ اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس وقت
بھی ہمیں اپنی جیب بھری دیکھ کر بدمست نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ خوشی کس
کام کی جب بنگال اور بہار میں ہمارے لاکھوں بھائی بند بھوکوں مر گئے
ہیں۔ رہنماؤں کا اندازہ ہے کہ صرف بنگال میں قحط سے ۳۵ لاکھ آدمی
مرے یہ ہے نمونہ ہماری خوشحالی کا۔

آداب اپنے صوبے سے باہر نکلیں۔ برطانوی ہندوستان کے سر پہ ۱۹۱۱ء میں
۳۰۰ کروڑ روپیہ قرضہ تھا۔ ۱۹۲۲ء میں یہ قرضہ ۶۰۰ کروڑ روپیہ ہوگیا اور ۱۹۲۹ء
میں ۹۰۰ کروڑ۔ قوم پرست ہندوستانی اسے نہایت کم اندازہ خیال کرتے ہیں
۱۹۲۹ء کے بعد قیمتیں گرنے لگیں تمام ملک کسادبازاری کی لپیٹ میں آگیا۔ نتیجہ
یہ ہوا کہ قرضہ بھی اسی نسبت سے بڑھنے لگا۔ ریزرو بنک آف انڈیا کی ۱۹۳۶ء
کی ابتدائی رپورٹ میں لکھا ہے کہ اگر ہم قرضہ کا حساب اجناس میں کریں تو
قیمتیں گرنے کی بنا پہ اس قرضہ کی مقدار دوگنا ہو جاتی ہے یعنی "۱۸۰۰
کروڑ روپیہ"۔

یہ نہ کہیے کہ کسان قرضہ کیوں اٹھاتا ہے؟ جب کسان کی زمین اس
کے گزارا کیلئے کافی نہ ہو اور جو تھوڑی بہت پیداوار ہو تو کچھ حصہ واپس
میں مٹ جائے۔ حکومت کا مالیہ زمیندار کا لگان اس کی رہی سہی جان نکال
دے۔ تو اس کا قرضہ اٹھا کر ہمیشہ کیلئے مشکلات کی دلدل میں پھنس جانا قدرتی
امر ہے وہ قرضہ اٹھاتا ہے۔ لیکن قرضہ کی رقم کھیتی باڑی پہ لگنے کی بجائے
اپنا وقت کاٹنے پہ صرف ہوتی ہے۔ آنے والے سال اسے پھر قرضہ اٹھانا پڑتا
ہے کھیتی پہ لگانے کے لئے نہیں۔ بلکہ اس لئے کہ اس سے پرانے قرضے
کچھ رقم ادا کر سکے۔ مالیہ یا لگان ادا کر دے اور اپنا اور اپنے کنبے کا آنے والی
فصل تک گزارا کر سکے۔ یہ ٹھیک ہے کہ قرضہ کا ایک بھاری حصہ وہ اس لئے اٹھاتا ہے
کہ اس بدنصیب ملک کا باشندہ ہونے کی صورت میں جس کے زرعی نظام کا
جنازہ نکل چکا ہے اس کے لئے اپنا اور اپنے کنبہ کا گزارا کرنے کیلئے اور
کوئی چارہ نہیں۔ جوں جوں قرضہ بڑھتا ہے ادائیگی زیادہ مشکل ہوتی
جاتی ہے اور پھر جب کوئی بلا سے آدبوچتی ہے تو قرضہ چکانا ناممکن ہوجاتا ہے

باردو تیار ہو گیا ہے۔ صرف ایک شرارہ کی ضرورت ہے۔

موجودہ جنگ کا ہندستانی زراعت پر اثر

یہ تو ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ کسان کی مفلوک الحالی و تہیدستی نے اس کو جانوروں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور اس کے ساتھ سماج کے سیاسی اور اقتصادی اداروں نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ زندگی کے پرلطف اور بہترین مسائل اس سے کوسوں دور تھے۔ غم میں اس کے آنسو کسی نے پونچھنے کی تکلیف گوارا نہ کی اور خوشی کا خاتمہ اسکے آباء اجداد اپنی وفات کے ساتھ ہی کر گئے تھے۔ ۱۹۳۰۔۱۹۳۳ کی اقتصادی بدحالی نے جو امریکہ کے بنکوں کے فیل ہونے سے شروع ہوئی اور جس نے تمام دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہندوستان پر اپنے خطرناک اور سم آلودہ ہتھیاروں سے اس شدت کا حملہ کیا۔ اور ہندوستان اقتصادی تاب نہ لانے کی وجہ سے لڑکھڑا کر جیسے کوئی خدائی قہر نازل ہو گیا ہو۔ جن لوگوں کو ایک وقت کا کھانا نصیب ہوتا تھا ان کی آنکھیں ایک لقمہ کے لئے بھی ترسنے لگیں۔ بہت سے کارخانے بند کر دیئے گئے مزدوروں کو ٹھوکریں مار کر نکال دیا گیا متوسط درجہ کے لوگوں کو پہلی بار محسوس ہوا۔ کہ وہ مزدوروں کی صفوں میں دھکیلے جا رہے ہیں۔ امریکہ اور دوسرے ممالک کی زرعی پیداوار نے جو مشینوں اور دوسرے سائنٹفک کیمیائی دواؤں کے استعمال سے کہیں بہتر تھی اس کی مانگ کو دنیا کی منڈی میں تو تقریباً بالکل ہی ختم کر دیا۔ دنیا نے پہلی بار سرمایہ دارانہ نظام کی کھوکھلی بنیادوں پر تعمیر کئے ہوئے محل کا شیرازہ بکھرتے دیکھا۔ امریکہ انگلستان و جرمنی کی سامراجی طاقتیں

اب یہ لغو دعوے نہیں کر سکتیں۔ کیوں کہ سرمایہ داری اپنے آپ کو مستقل
اور مستحکم حالت پہ لے آئی ہے اور اس نظام میں اب پیداوار دن دگنی
رات چوگنی ترقی کرے گی مثلاً دسمبر ۱۹۳۲ء میں برطانوی حکومت نے جو مراسلہ
امریکہ کی حکومت کو روانہ کیا اس میں یہ صاف طور پر واضح کیا گیا کہ پیداوار
اور تجارت میں جو ترقی ۱۹۲۳ء تک رہی وہ ایک سراب کی طرح تھی
اور اسی ترقی میں موجودہ تباہی کے بیج بو دیئے گئے تھے

ہندوستان میں اس کی پہلی شکل قیمتوں کا گرنا تھا۔ اگر ۱۹۲۸ء
کی قیمتوں کے انڈکس نمبر کو ۱۰۰ مان لیا جائے تو غلہ کی قیمت ۱۹۳۳ میں ۶۶ تھی
اور خام پٹ سن کی ۴۱ اور خام روئی کی ۵۰ تھی۔ گو یہ قیمتیں ۱۹۳۷ میں ۱۵
فی صدی بڑھ گئی تھیں۔ مگر پھر بھی اگر عام طور پر دیکھا جائے تو ۱۹۲۹ اور
۱۹۳۷ کے درمیانی عرصہ میں ایک کسان کی آمدنی بہت کم ہو گئی تھی۔ اور پھر
قرضہ اور مالیہ کے بوجھ سے اس کی حالت اور بھی خراب ہو گئی تھی۔ اس کا اندازہ
اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یو۔پی میں گنا ۳ آنہ من بک رہا تھا۔ حالانکہ
گنا کی چھان بین کرنے والی کمیٹی نے ۸۔ فی من کو بھی کم قیمت قرار دیا تھا۔ گندم ۳؍
۴ آنہ فی من سے اور روئی ۵ روپیہ سے بھی کم قیمت پر بک رہی تھی۔ مگر سب سے
افسوسناک بات یہ تھی کہ ہمارے ملک میں کسان اور زمین کی حالت بہتر
کرنے کیلئے کوئی ٹھوس تجویز موجود نہ تھی۔ ہماری مہربان حکومت جو بھی
حکم ہمارے سر پہ تھوپتی۔ وہ انگلستان کے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں
کے فائدہ کے لئے ہوتا تھا۔ ہندوستان جہنم میں جائے انہیں اس سے
کیا۔ ہندوستان کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ جس میں ۷۰ فی صدی لوگ زمین
پہ گزارہ کرتے تھے۔ اُن کا ایک ایسا مقصد تھا جس نے کسان کو بھی اقتصادی

ندہ پر بالکل کمزور کر دیا تھا۔ اور سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ کوئی ہندوستانی یہ نہ سمجھ سکا کہ جب کہ جاپان ہمارے ملک پر درندوں کی طرح حملہ کریگا۔ تو اسوقت ہندوستانی کسان کا کیا بنے گا۔

جنگ شروع ہونے کے چند مہینوں بعد ایسا معلوم ہونے لگا کہ جو سیاہ بادل ہندوستان کی زراعت پر اقتصادی بدحالی کے دنوں سے چھائے ہوئے تھے۔ وہ اب دور ہونیوالے ہیں۔ ہر چیز کی قیمت بڑھنے لگی اور خصوصاً غلہ وغیرہ کی حکومت اور پبلک دونوں کا خیال تھا۔ کہ قیمتوں کے چڑھاؤ میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالی جائے تاکہ کسان کو جو مصیبت گذشتہ دس سال میں اٹھانی پڑی ہے اس کا کچھ ازالہ ہو سکے۔ اسی لئے قیمتوں کے کنٹرول کرنے کے لئے جو پہلی کانفرنس اکتوبر ۱۹۳۹ء میں بلائی گئی اس میں یہ فیصلہ کیا گیا۔ کہ قیمتوں کو کچھ عرصہ کے لئے بلا روک ٹوک بڑھنے دیا جائے۔ مگر اس میں کامیابی اسی صورت میں ہو سکتی تھی۔ کہ اگر بڑھتی ہوئی پیداوار کی مانگ بھی بڑھنے دیجاتی۔ مگر جنگ کے تیزی سے بڑھنے اور جرمنی کے تمام مشرقی اور مغربی یورپ پر قبضہ کرنے سے یورپ کی تمام منڈی ہندوستان کے مال کے لئے بالکل بند ہو گئی۔ مشرق میں جاپانی فاشستوں کا سیلاب ایشیاء کو آزاد کرانے کے بہانے اپنی ملک گیری کی ہوس کو پورا کر رہا تھا۔ چین پلایا۔ فلپائینز، سیام اور برما وغیرہ سے ہماری تجارت تقریباً بالکل بند ہو گئی۔ لیکن اتحادی وغیر جانبدار ملکوں سے بھی ہماری تجارت بہت کم ہو گئی تھی۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ جن جہازوں پر مال لاد کر ایک ملک سے دوسرے ملک میں لایا جا سکتا تھا۔ وہ تمام نزر جنگ کی آغوش میں تھے۔ اُن پر ہندوستان کا خام مال باہر جانا تو درکنار اپنے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ہندوستان کے ساحلی جہازوں

میں بھی اشیاء کا بھیجنا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ یورپ سے ہماری تقریباً
۳۰ کروڑ روپیہ سالانہ کی تجارت بند ہوگئی اور جاپان سے تقریباً ۱۴ کروڑ
روپیہ سالانہ کی۔ ہندوستانی کسان کی آمدنی میں کچھ عارضی اضافہ ہوا وہ اب
نقصان میں تبدیل ہونے لگا۔ اب سوال یہ تھا۔ کہ قیمتوں پر کس طرح قابو
پایا جائے اور فالتو پیداوار کو کہاں اور کس طرح کھپایا جائے اور کن لوگوں
کے سپرد کیا جائے۔ یعنی کوئی ایسا حل نکالا جائے کہ کسان پھر پرانی اور اصلی
حالت پر آجائے۔ اور بھوک اور افلاس کے گڑھے میں نہ گرے۔ نئی منڈی
تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہندوستان سے ایک مشن زیر سرکردگی ڈاکٹر
ملک اور ڈاکٹر گریگوری امریکہ پہنچا اور امریکہ میں ہندوستانی خام مال کی
کھپت کی کوشش کی گئی۔ مگر چونکہ امریکہ خود خام مال تیار کرتا ہے اور ہندوستانی
خام مال سے کہیں زیادہ اس لئے اس مشن کو مایوس لوٹنا پڑا۔ ہندوستانی کسان
کی قسمت میں اس وقت تک ٹھوکریں ہی ٹھوکریں لکھی تھیں۔ جب تک وہ اپنے سر سے
بیرونی حکومت کے جوئے کو اتار نہ پھینکتا۔ اس کے علاوہ کسان کے لئے یہ تو
بہت مشکل تھا۔ کیونکہ وہ صدیوں کے توہمات میں پھنسا ہوا یہ نہ سمجھ سکتا تھا
کہ کھیت میں ان اشیاء کو بویا جائے جن کی مانگ ہے اور موجودہ پیداوار
کے طریقہ کو بدل دیا جائے۔ زمین کا اسی فیصدی حصہ تو خوراک پیدا کرنے میں
کاشت کیا جاتا ہے۔ غلے کی جگہ کوئی اور چیز کاشت کرنا بہت مشکل تھا
کیوں کہ اس سے قحط پیدا ہونے کا خطرہ تھا۔ دوسرے خام ملی اور غیر خوردنی
اشیاء کی کاشت میں کمی کرنے کی کچھ گنجائش نہ تھی۔ مگر کسان کو اس بات کے
لئے مجبور کرنا نہایت مشکل کام تھا۔ بہر حال اس میں حکومت کو کچھ کامیابی بھی
ہوئی۔ کچھ روئی اور پٹسن کی جگہ چاولوں کو دے دی گئی مگر ہندوستانی ضرورت

کی ضرورت کے مطابق یہ ایک ناکام سکیم تھی اس لئے یہ ہوا کہ روئی
سن کی جگہ چاولوں کو دے دی گئی مگر ہندوستانی زراعت کی ضرورت کے
مطابق یہ ایک ناکام سکیم تھی۔ اس لئے یہ ہوا کہ روئی، پٹ سن اور
تیل کے بیجوں کی قیمتیں جو پہلے منڈی میں بھاؤ سے گر گئی تھیں اب پھر
بڑھنے لگیں۔ اور کسان کو تھوڑا عرصہ ہی گرتی ہوئی قیمتوں سے مقابلہ
کرنا پڑا۔

اس کے بعد ہندوستان کے سر پر ایک نئی مصیبت آ نازل ہوئی۔ وہ یہ
کہ کھانے پینے کی اشیاء میں کمی واقع ہو گئی ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۹ء تک جب کہ دوسرے
ملکوں میں زرعی پیداوار دگنا ہو گئی۔ تو ہندوستان میں پہلے کی نسبت کمی
واقع ہوئی۔ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس سے بد سے بدتر حکومت کے بھی رونگٹے
کھڑے ہو جاتے مگر ہماری حکومت برطانیہ جس کی سامراجی بنیادیں ہندوستان
میں کافی مضبوط ہو چکی تھیں ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ہندوستان کے غلہ کی کل
پیداوار ۳۰-۱۹۲۹ء میں ۵ کروڑ ۳۸ لاکھ ٹن تھی ۱۹۳۱ء میں اگلے سال ۵ کروڑ
۴۰ لاکھ ٹن تھی۔ مگر ۱۹۴۰ء میں ۵ کروڑ ۳۰ لاکھ رہ گئی۔ اور ۱۹۴۱ء میں صرف
۵ کروڑ ٹن۔ اگر روس سے اس کا مقابلہ کیا جائے تو انسان حیران رہ جائے
روس کی پیداوار نہ صرف دوگنی ہو گئی بلکہ روس دنیا بھر میں بہترین گندم پیدا کرنے
لگا۔ یہی تخمینہ آئندہ کے متعلق بھی لگایا جا سکتا ہے۔

اس دوران میں ہماری آبادی ۳۲ کروڑ سے ۳۸ کروڑ ہو گئی۔ یعنی
ہماری آبادی میں ۱۵ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ ہماری حکومت ایسے شرمناک
جرم کی مرتکب ہوئی جس پہ آنے والی نسلیں اور عوام اسے کبھی معاف
نہیں کریں گے۔ جس کا خمیازہ ہندوستانی آج تک بھگت رہے ہیں بنگال کے

قحط کے ۳۵ لاکھ انسانوں کی موت اور آئندہ آنے والے قحط کے خطرات کی ذمہ داری
تمام تر ایسی ناکارہ حکومت پر عائد ہوتی ہے جس نے ہماری تمام زراعت کو تباہ
کر دیا ہے۔ ہندوستانی اقتصادی ماہروں میں اس بات میں اختلاف ہے کہ ہندوستان
اپنے لئے پوری خوراک پیدا کر سکتا ہے یا نہیں عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر انور اقبال
قریشی کا خیال ہے کہ ہندوستان اس معاملے میں خود کفیل ہے۔ مگر ڈاکٹر رادھا کمل
مکرجی اور ناناوتی کا خیال ہے کہ تقریباً ۳۰ فیصدی لوگ اپنا پیٹ ایک وقت
پالتے ہیں یا بہت ناکارہ خوراک پر گزارہ کرتے ہیں اور یہی خیال ڈاکٹر آئیکرائڈ
کا ہے۔ جن کی تحقیقات کے مطابق ہندوستان میں ۳۰ فیصدی لوگ بہت بری طرح
پلتے ہیں اور ۴۰ فیصدی کے کافی خوراک پر گزارہ کرتے ہیں۔ بہرحال خوراک کمیٹی کا
تخمینہ صرف ۱۵ سے ۲۰ فیصدی لوگوں کے متعلق ہے۔ کمی شدت کی صورت
اس وقت اختیار کر گئی جس وقت برما پر جاپان کا قبضہ ہو گیا۔ برما سے تقریباً ۱۳
لاکھ ٹن چاول ہر سال درآمد ہوتے تھے مگر اب وہ بھی بند ہو گئے۔

اگر صرف اتنا ہوتا تو بھی برداشت کیا جا سکتا تھا مگر مصیبت کے بعد ہی مصیبت
آنازل ہوئی۔ ہندوستان کی کھیتی کا بیشتر حصہ بارانی ہے۔ اسلئے کسی وقت بھی
بارش کا نہ ہونا یا ٹھیک وقت پر نہ ہونا ہزاروں لاکھوں انسانوں کی موت کا سبب
ہو سکتا۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں یہی ہوا۔ بنگال کے چاولوں کی فصل تباہ ہو گئی۔ اس
کے ساتھ ساتھ ملک کے ذرائع آمد و رفت فوجی ضروریات پہلے پورا کرتے تھے۔ اسلئے
اجناس زیادہ خوراک پیدا کرنے والے علاقوں سے کم خوراک پیدا کرنے والے علاقہ میں نہ
جا سکتی تھی۔ کسان قحط و کمی کے خطرے کو محسوس کر کے بہت تھوڑا غلہ منڈی میں
پہنچنے کے لئے بھیجتے نیز اس کثیر تعداد ملک میں کرنسی کے پھیلاؤ نے صورت حالات کو اور بھی
بدتر بنا دیا۔ لیکن جس بات نے آگ پر تیل کا کام کیا وہ حکومت کی ناکارہ مشینری تھی

اور اس کے بیمو پخو ڈ بڑے بڑے منافع خور اور چور بازار کرنیوالوں کا یہ انسانیت کش
عمل تھا۔ کہ انہوں نے ملک کے عوام کا بڑی بیدردی سے خون چوسنا شروع کر دیا
حکومت نے قیمتوں پر کنٹرول تو کیا مگر جس چیز پر کنٹرول کیا گیا اسے منافع خوروں
کے ہاتھ میں رہنے دیا گیا جس سے چور بازاری اپنی پوری طاقت کے ساتھ غریب مزدوروں
اور کسانوں کے گلے دبوچنے لگے دوسرے ملکوں میں اسی جرم کی سزا موت ہو سکتی تھی
مگر ہندوستان میں ان لوگوں کی جیبیں حکومت خود بھرتی تھی۔ آخر کیوں نہ ہو بھی۔ تو
آہنی ستون ہیں جن پر حکومت برطانیہ نے اپنے سامراج کی بنیاد قایم کر رکھی ہے
اس کے علاوہ ایک اور شرمناک اور دردناک قصہ بھی سن لیجیئے۔ وہ یہ کہ صوبائی
حکومتیں جنھیں سچ عام لوگوں کی چنی ہوئی حکومتیں بھی شامل ہیں۔ بھی منافع خوری کے جرم میں مبتلا
رہیں مثال کے طور پر یوپی میں گندم کی قیمت پنجاب کی نسبت ۳ روپیہ فی من زیادہ تھی
سندھ کی حکومت [illegible] روپیہ فی من گندم خرید کر ۱۱ روپیہ فی من کے حساب سے بیچتی تھی۔ اس
سے بڑھ کر افسوسناک بات کیا ہو سکتی تھی کہ بنگال کی حکومت نے جب کہ لوگ قحط
سے مر رہے تھے پنجاب سے ۱۱۔ اور ۱۲ روپیہ کے درمیان خرید کر ۱۸۔ اور ۲۰ روپیہ
من کے حساب بیچی پنجاب کی بدنام یونینسٹ حکومت نے بھی دوسرے لوگوں کو
قحط کے جہنم میں جھونکنے سے کوئی دریغ نہ کیا۔ سر چھوٹو رام اس میں پیش پیش
تھے یہاں تک کہ وہ زمینداروں کو کھلم کھلا تلقین کرتے تھے کہ وہ گندم اپنے پاس
سٹاک کریں اور منڈی میں نہ بھیجیں باوجود اس کے کہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ عیاں
طور پر ان پر حاوی ہوتا تھا۔ لیکن اس کا مطلب تو یہ تھا کہ عوامی تحریکات کا گلا
گھونٹا جا سکے اس کا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا۔ کہ ان ستونوں کو زمین میں دفن کر دیا جائے
جس پر شہنشاہیت کی عمارت کھڑی تھی۔
اسکے ساتھ ساتھ ملک میں سختی کا دور دورہ شروع ہوا۔ کانگرس کی اگست

کی قرارداد پاس ہو گئی۔ لیڈروں کو ۹ اگست کی رات کو گرفتار کر لیا گیا۔ لوگوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کی گئی ہزاروں انسانوں کے خون سے زمین سرخ ہو گئی۔ لاکھوں انسان ڈیفنس کے نام پر جیلوں میں دھکیل دیئے گئے یعنی کہ حکومت نے بے پناہ تشدد کیا۔ ظلم اور جور کے ہر اس طریقہ کو عمل میں لانے سے گریز نہ کیا جو اس کے بس میں تھا۔ یہ دور آہستہ آہستہ ختم ہوا۔ مگر اس کے بعد ایک ایسے دور کا آغاز ہوا کہ جسے ہندوستان نے اپنی تاریخ میں نہ کبھی دیکھا اور نہ کبھی اس کا تجربہ کیا تھا۔ یہ وہ دور ہے جس نے دنیا کے خونی سے خونی عہد کو بھی مات کر دیا ہے۔ دنیا کی تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ کبھی کہیں پچاس لاکھ انسانوں کی موت صرف بھوک کی وجہ سے ہوئی ہے۔ انسانوں کے مردہ جسموں پر گیدڑوں اور کتوں کی لڑائی اور گیدڑوں اور کتوں کے مردہ جسموں پر انسانوں کی جھپٹیں ایسے واقعات تھے جسے انسانی تاریخ بیان کرنے سے گریز کرے گی۔ ہزاروں ماؤں اور بہنوں نے صرف ایک ایک لقمے کے لئے اپنی عصمت و عفت کے گراں مایہ پونجی کو زر دار اور وحشی انسانوں کے ہاتھوں بیچا۔ اگر کوئی عورت اپنے بچوں کو سڑک پر چھوڑ کے جا رہی ہے تو کسی مردہ ماں کی چھاتی سے اس کا بچہ دودھ پینے کی بدستور کوشش کر رہا ہے۔ ایک محب وطن ہندوستانی کا سر اپنی ماؤں اور بہنوں کی ذلت دیکھ کر جھک جاتا ہے۔ مگر ہمارے چور بازاری کرنے والے منافع خوروں کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ حکومت کی طرف سے کنٹرولوں کی بوچھاڑ کی گئی۔ مگر اشیاء غائب تھیں۔ آپ دو گنے تگنے داموں پر جتنا چاہیں غلہ و کپڑا خرید سکتے تھے۔ ۸۰ اور ۱۰۰ روپیہ فی من گندم اور چاول بنگال میں بکتے رہے اور اس پر طرہ یہ کہ وسط مشرق میں خوراک ہندوستان سے مہیا کی جا رہی تھی۔ گندم پر پہلا کنٹرول ۵ دسمبر ۱۹۴۱ کو کیا گیا اس کے بعد ۳ اپریل ۱۹۴۲ کے حکم کے مطابق غلہ کا ایک جگہ سے دوسری جگہ بغیر پرمٹ جانا بند کر دیا گیا۔ مئی ۱۹۴۲ کے حکم کے مطابق گندم کی سپلائی کو بھی کنٹرول کرنے کی سکیم جاری کی گئی۔ کیوں کہ حکومت

عوامی تعاون سے گریز کرتی تھی۔ اس لئے بلیک مارکٹ کم ہونے کے بجائے اور تیز
ہو گئی۔ حکومت ہند کی طرف سے تمام صوبائی حکومتوں اور ریاستوں سے کہا گیا کہ وہ
مئی ۱۹۴۴ء والے حکم پر عمل کرنے کی کوشش کریں جس کے مطابق ۲۰ من سے زیادہ
کوئی شخص اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ بنگال اور پنجاب سب سے آخر میں تھے بنگال
میں اس پر عمل نہ ہونے سے زیادہ شدت کی صورت اختیار کر گیا۔ کسان
اپنی زمینیں چھوڑ کر شہروں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ کیوں کہ بیماری کے پھیلنے
اور بارش نہ ہونیکی وجہ سے زمین ناقابل کاشت ہو گئی اور جہاں کاشت ہو سکتی تھی
بیماری ہے جس نے کہ لاکھوں انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ یہ کاشت نہ ہو سکی
فصلیں تیار کھڑی تھیں مگر کاٹنے والا کوئی نہ تھا۔ حکومت سوائے کنٹرول اور منافع خوری
کے خلاف حکم بنانے کے سوا۔ اور کوئی بھی اقدام اٹھانا چاہتی ہی نہ تھی۔ ڈاکٹر انور
اقبال قریشی نے حکومت کی پالیسی کو یوں بیان کیا ہے کہ "شروع میں حکومت کی پالیسی جیب
تھی" اور اس کے بعد جب حالت خراب ہو گئی "ٹھہرو۔ دوڑو" اور جب حکومت حالات
کو درست کرنے کے ناقابل ہو گئی تو "فنش فنش" کی تھی

ہندوستان میں اقتصادی کنٹرول ناکام ہونے کا سب سے زیادہ اثر غریب
کسانوں پر پڑا۔ یہ بات قحط بنگال اور ۱۹۴۷ء میں امریکہ میں ہاٹ سپرنگ کے مقام
پر خوراک کی کانفرنس میں صاف طور پر عیاں ہو گئی کہ اسکی وجہ حکومت کی ناکارہ
پالیسی اور زراعت کی بنیادی کمزوریاں ہیں جنگ نے اس مسئلہ کو اور بھی تیز کر دیا۔
غریب کسان ظلم پر ظلم سہے جا رہا تھا۔ اس کی اقتصادی حالت خراب ہو چکی تھی اور
مجلسی ڈھانچہ تباہ ہو چکا تھا۔

اس کے مقابلہ میں اگر ہم ذرا انگلستان کی زراعت کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا
کہ جنگ کے دوران میں جب کہ ہر انگریز جنگ کو جیتنے میں سب کچھ قربان کرنے کے لئے

تیار تھا۔ ان کی زراعت نے سائنٹفک طور پر اتنے کم عرصہ میں اتنی زیادہ ترقی کی جتنی اس سے دُو گنے عرصہ میں پہلے کبھی نہ کی ہو گی جنگ سے پہلے انگلستان آدھے سے زیادہ خوراک باہر سے درآمد کیا کرتا تھا جنگ کے دوران میں نہ صرف وہ تمام لوگوں کے لئے کافی خوراک مہیا کر سکا۔ بلکہ اُن کا خوراک کے لحاظ سے معیار زندگی پہلے کی نسبت کہیں زیادہ تھا۔ کنٹرول اور راشننگ کا بہترین انتظام تھا۔ انگلستان میں اگر ایک انسان بھوکا مر جاتا۔ تو چرچل سے لیکر معمولی سے معمولی پارلیمنٹ کے ممبران تک کئی راتیں نیند نہ آتی۔ اور کسی وقت بھی انہیں برطرف کیا جا سکتا تھا۔ مگر ہندوستانیوں کی موت پر کوئی کتا بھی نہ بھونکا کسی سیاسی ماہر کو جمہوریت کا خون ہوتے دیکھ کر غصہ نہ آیا۔

ہماری مہربان حکومت نے ۱۹۴۴ء میں ایک کمیشن مقرر کیا جس کا نام انڈین فیمن انکوائری کمیشن تھا جس کا کام تھا کہ وہ قحط بنگال کی وجوہات اور خوراک کی کمی کی اور بیماریوں کے پھیلنے کی ——— وجوہات بیان کرے اور ساتھ ساتھ اپنی سفارشات بھی پیش کرے۔ کہ اس سلسلے میں کیا پالیسی اختیار کرنی چاہئے اس کمیشن نے اپنی رپورٹ ۱۹۴۵ء کے آخر میں شائع کی اس رپورٹ میں بہت سی خامیاں تھیں مگر اس کے باوجود انھوں نے کہا۔ کہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر انسان کے لئے کافی اور صحت بخش خوراک مہیا کرے اس کے علاوہ انہوں نے زراعت اور صنعت کی ساتھ ساتھ نشوونما پر زور دیا۔ اور زراعت کی بنیادی کمزوریاں کو دور کرنے کی تلقین کی۔

جنگ کا اثر مختلف صوبوں کے کسانوں پر مختلف ہوا مگر ان کے معیار زندگی میں مجموعی طور پر ترقی کی بجائے کافی تنزل ہوا۔ اور کوئی ایسے اعداد و شمار موجود نہیں کہ جن سے مذکورہ بالا امر کا اندازہ لگایا جا سکے۔ ہم یہ بات تسلیم

کرنے کو تیار ہیں کہ پنجاب میں کسان کی حالت پہلے سے بہتر ہو گئی۔ مگر اسکی وجہ صرف قیمتوں میں زیادتی نہیں تھی۔ بلکہ ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی فوج کا ایک بہت بڑا حصہ پنجابی نوجوانوں کا تھا۔ جو زیادہ تر دیہات سے بیکاری کی وجہ سے فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ یہ بات بھی قابل قبول ہو سکتی ہے کہ کچھ دیہی قرضہ فوجی آمدنی اور پیداوار کے بڑھتے ہوئے نرخوں سے اتارا گیا ہے۔ مگر یہ حقیقت تمام صوبوں پر صادق نہیں اترتی۔ خصوصاً بنگال۔ بہار۔ اڑیسہ۔ مدراس۔ اور بمبئی میں تو حالات بالکل برعکس تھے۔ کسانوں کے قرضے نہ صرف بڑھے بلکہ انہوں نے اپنے زمین۔ مکان۔ زیور۔ وغیرہ بیچ کر بڑھتے ہوئے اخراجات پر خرچ کر دیئے کئی اقتصادی ماہروں کا خیال ہے کہ کھانے کے لئے زیادہ خوراک ملتی رہی ہے۔ مگر یہ بھی ایک دو صوبوں کے علاوہ دوسرے صوبوں کے متعلق غلط نظریہ ہے ان کے علاوہ ہمارے کسانوں کی حالت کا بالکل جنازہ ہی نکل گیا۔ حالات نے پھر ان کو خود غرض بنا دیا اور کسان اس قابل نہ رہا کہ موجودہ دنیا کے پیچیدہ اور تلخ تجربات کو اچھی طرح سمجھ سکے۔

"مزدور"

زرعی مزدوروں کی داستان ختم ہوئی۔ اب عام مزدوروں کی کہانی سنیئے۔
ایک وقت تھا کہ ہندوستان کی تاریخ میں آج کے اصطلاحی معنوں میں مزدور کا کوئی وجود نہ تھا۔ کھیتی اور اضافی محنت دو لازم ملزوم باتیں تھیں اور سیٹ کے رواج نے ان تھوڑے بہت لوگوں کو جو مخصوص قسم کے مزدور تھے قوم کے سواد اعظم سے جدا نہ ہونے دیا تھا صنعتی عہد کی نوادرات میں بے گھر محنت کش مزدور اور سرمایہ دار شامل ہیں۔ جوں جوں نئی قسم کی صنعت ہندوستان میں بڑھ رہی ہے بے گھر محنت کش مزدوروں کی تعداد (جنہیں کسی بہتر اصطلاح کے فقدان کی بنا پر ہم پرولتاری مزدور کہہ سکتے ہیں) بڑھتی جا رہی ہے یہی وہ مزدور ہیں جو مارکس کی رائے میں انقلاب کی روح رواں ہیں۔

مزدوروں میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو اچھے گھروں میں رہتے ہیں جنہیں فراغت کی زندگی میسر ہے۔ ایسے مزدوروں کا شمار متوسط طبقہ میں کیا جائیگا بعض حالتوں میں تو کاریگر مزدور اچھے پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ تنخواہ پاتے ہیں ہندوستان میں کل غیر کاشتکار مزدوروں کی تعداد پانچ کروڑ ہے ان میں ایک کروڑ پچاس لاکھ لوگ متوسط اور اعلےٰ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں یعنی ملازم پیشہ لوگ ہیں۔ جہاں تک منظم صنعت کا تعلق ہے اسمیں ان کی تعداد پچاس لاکھ سے زیادہ نہیں ہے۔ بقیہ تین کروڑ انسانوں میں کم وبیش دس لاکھ انسان ایسے ہیں جو غیر پیداکار کاموں میں لگے ہیں غیر پیداکار مزدور سے مراد

وہ مزدور ہے جس کی محنت کسی صنعتی شے کو معرض وجود میں لانے کا موجب نہیں ہوتی۔ ان میں مسجدوں کے امام مذہبی پیشوا۔ فقیر بھک منگے اور گھریلو ملازم ہیں

آخری درجے پر غیر کاریگر مزدور ہیں ان میں اکثریت۔ دستکار اور اہل حرفہ لوگوں کی ہے ان کے قطع نظر اور مزدور ہیں جو یا تو گھروں میں بیٹھ کر کام کرتے ہیں یا کارخانوں، کانوں یا کارخانوں وغیرہ میں کام کرنے والے مزدور تو بہر حال مزدوروں میں شامل ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق سرکاری تحقیقات اور رپورٹیں موجود ہیں۔ مگر ایسے مزدوروں کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ جو کسی باقاعدہ صنعت میں کام نہیں کرتے اور کوئی زیادہ ہمدردی کا محتاج اور توجہ کا مستحق نہیں۔ انکی تعداد ستر اسی لاکھ کے لگ بھگ بیان کی جاتی ہے۔

ان مزدوروں کی حالت سب مزدوروں سے ابتر ہے یہ وہی مزدور ہیں جنہیں آپ نے کبھی مکان بنانا یا بوجھ اٹھوانا ہو۔ تو طلب کرتے ہیں یہ لوگ بازار کے چوکوں میں اپنے آپ کو ایک روز کیلئے بیچنے کی خاطر بیٹھ جاتے ہیں اکثر انہیں مایوس ہونا پڑتا ہے۔ کیونکہ کوئی خریدنے والا نہیں ملتا۔ یہ مزدور سڑکیں، نہریں اور بندوں کی تعمیرات پر کام کرتے ہیں یا بندرگاہوں۔ اور ریلوے میں کوئی فالتو کام ہو تو وہاں لگ جاتے ہیں۔ ان کا کام سیدھی مزدوری ہے یا یوں کہیے کہ یہ سب سے نچلے درجے کے مزدور ہیں۔ جو اپنے سر اور پیٹھ پر بوجھ لاد کر روٹی کماتے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان میں سب سے زیادہ محنت کش ہیں۔ اور ان ہی کی حالت سب سے ابتر ہے۔

حکومت کے سرکاری اور نیم سرکاری محکمہ جات اپنے کام ٹھیکیداروں کو دے دیتے ہیں ٹھیکیدار ان مزدوروں کو کسی خاص معاہدہ یا شرائط کے ماتحت کام پر نہیں لگاتا بلکہ اجرت بازار کے نرخ کو دیکھ بھال کر ادا کی جاتی ہے۔ جو مختلف مقامات اور اوقات میں مختلف ہوتی ہے۔ ٹھیکیدار ان مزدوروں کو کم سے کم اجرت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور زیادہ سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ اگر مزدور چوں چراں کرے تو اسے جواب دے دیا جاتا ہے۔ عام دنوں میں ان مزدوروں کی اجرت دو اور چھ آنہ کے درمیان

ہوتی ہے۔ مگر جنگ میں یہ اجرت دو روپیہ تک پہنچ گئی۔

گھریلو کھڈیوں پر کام کرنے والے جولاہے اور نجی خدمات پر مامور مزدور بھی خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ ان جولاہوں کی تعداد تیس لاکھ کے لگ بھگ ہو گی۔ یو۔پی اور بہار میں ان جولاہوں نے اپنے آپ کو مومن کے نام سے منظم کرنا شروع کیا ہے اور وہ تھوڑی بہت بیداری کا اظہار بھی کر رہے ہیں۔ کتنی بدقسمتی ہے کہ چھوٹے چھوٹے مزدور پیشہ لوگ بھی امرا کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ یہ جولاہے جنہیں گھریلو کھڈیوں پر کام کرنے کی بنا پر چھوٹے چھوٹے پیداکار کا نام دیا جا سکتا ہے۔ عموماً ساہوکار کے دستِ نگر رہتے ہیں یہ ساہوکار ان کے مال کو منڈی میں فروخت کرنے کا انتظام کر دیتا ہے۔ اور اس کے عوض وہی کچھ حاصل کرتا ہے جو عام طور پر بیچولیے حاصل کرتے ہیں۔ یہ بچولے جولاہوں کے ان داتا ہیں اور غریب پیداکار محنت کش جولاہے ان کے غلام۔ اس نظام نے بیچ کے بیوپاریوں کو امیر بنا دیا ہے اور کام کرنے والے محنت کشوں کو جن کے سر پر وہ بیٹھے ہیں غریب اور مفلوک الحال۔

اب نجی خدمات پر مامور مزدوروں سے متعلق عرض ہے۔ کہ ان کی تعداد بیس لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ ان میں دھوبی اور حجام وغیرہ شامل ہیں یہ لوگ پشت در پشت سے یہی کام کرتے چلے آ رہے ہیں ہندوستان کی عام زبان میں پیشہ قوم کی جگہ حاصل کر چکا ہے اور اس اعتبار سے تو یہ بھی درست کہ ان لوگوں کے مفاد اور کسی حد تک رہنے سہنے کے طریقے ایک ہوتے ہیں اصل بات یہ ہے کہ ہمیں جس چیز کو جماعت یا طبقہ کا نام دینا چاہیے قوم کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مزدوروں کو اپنی جماعتی حیثیت کا علم ہے۔ اس لیے یہ پیشے خاندانی پیشے کہلاتے ہیں۔ ان میں مزدور کا خاندان کا خاندان کام کرتا ہے۔ اور اوقاتِ محنت کا کوئی تعین نہیں۔ گاؤں میں ان لوگوں کی حیثیت اچھوت سے مشابہ ہی

اونچی ہو۔ ان سے گو مجلسی علیحدگی نہیں برتی جاتی اور شخصی طور پر نجس بھی قرار نہیں دیا جاتا۔ مگر دیہات میں یہ لوگ کمین کے نام سے پکارے جاتے ہیں اور اونچے پیشہ والے مثلاً زمیندار اور کسان انہیں اپنے مقابلہ میں حقیر سمجھتے ہیں اس کا پتہ لفظ کمین سے لگتا ہے۔ کمین کا مطلب یا تو کوئی کام کرنے والا ہو سکتا ہے یا نیچ۔ مگر زمیندار چونکہ خود کام کرتا ہے اس لئے یہ قرینِ قیاس نہیں کہ یہ نام اُسے کام کرنے کی بنا پر دیا گیا ہو۔ "اس لئے نیچ" کے معانی زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں۔

ان مزدوروں کے علاوہ جو کسی رجسٹرڈ کارخانہ میں کام کرتے ہیں۔ مزدوروں کی ایک بھاری تعداد چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں کام کرتی ہے۔ ایسے کارخانے ہر چھوٹے بڑے شہر میں نظر آتے ہیں۔ بعض میں تو کارخانوں کے مالک بذاتِ خود کاریگر مزدور ہوتے ہیں۔ ایسے کارخانوں پر فیکٹری قانون حاوی نہیں ہوتا۔ اور ان میں بیس سے زیادہ مزدور کام نہیں کرتے۔ ان کارخانوں میں تو بارہ بارہ گھنٹوں سے بھی زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ مدراس میں آٹھ سے بارہ سال کے بچے رات کو کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ قریباً قریباً یہی حالت بڑوں کی ہے۔ بچوں کے اوقات کار بعض اوقات بڑوں سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ حالانکہ قانوناً کام کی کوئی قانونی اجرت نہیں بنتی۔ پنجاب اور دیگر کئی صوبجات میں ان کارخانوں سے متعلق قانون بنائے گئے ہیں۔ اوقات کار کا تعین اور ہفتہ میں ایک روز چھٹی کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ مگر کارخانہ دار اتنے بیوقوف نہیں کہ وہ حکومت کے کسی نیک قانون کو اپنے مفاد کے خلاف استعمال ہونے دیں۔ بڑی بدقسمتی تو یہ ہے کہ حکومتیں قانون بنا کر اس کے نفوذ میں سرگرمی کا اظہار نہیں کرتیں۔ اور اس طرح قانون اپنے بہتر پہلوؤں میں معطل رہتا ہے۔ ان کارخانوں میں تنخواہ کا معیار مختلف ہے جس

طرح کا کاریگر ہو ویسی ہی تنخواہ ملتی ہے۔ اکثریت آٹھ اور دس روپیہ کے درمیان حاصل کرتی ہے۔ بلاشبہ جنگ میں مزدوروں کی اجرتیں بڑھ گئیں ہیں اور انہیں کام کی تلاش میں زیادہ سرگردانی نہیں کرنا پڑتی۔ بلکہ اشیاءِ استعمال اور اشیاءِ خوردنی کی قیمتیں تیس تیس اور پچاس پچاس گنا بڑھ چکی ہیں۔ حالانکہ مزدوروں کی اجرت میں زیادہ سے زیادہ تین یا چار کی نسبت سے اضافہ ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مزدور اس مہنگائی اور آشوب کے زمانہ میں بھی نہایت قلیل اجرت پاتے ہیں اتنی قلیل کہ ان کا مشکل گزارہ ہو سکے۔ ان کارخانوں میں تنخواہ کی کوئی تاریخ مقرر نہیں بعض اوقات تو بیس بیس تاریخ تک نوبت آپہنچتی ہے۔

بیڑی بنانے والے کارخانوں کی حالت اور بھی بری ہے اس کے متعلق ہم اپنے منہ سے کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ ایک انگریز محقق رقمطراز ہیں کہ بیڑی بنانے کے کئی کارخانوں میں اتنی کم جگہ ہوتی ہے۔ کہ مزدور اسقدر سکڑ کر بیٹھتے ہیں کہ آگے یا پیچھے سرکنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ کئی کارخانوں کا محل وقوع تنگ و تاریک اور سم زدہ مقامات ہیں۔ جہاں فرش مٹی کے کچے ہوتے ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ صنعتی اعتبار سے یہ جگہیں ہر طرح غیر موزوں ہوتی ہیں۔ ان کارخانوں میں چھوٹے چھوٹے نوخیز بچے گھنٹوں کام کرتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو کام دینے پر اس لئے ترجیح دی جاتی ہے کیوں کہ ان کی چھوٹی چھوٹی انگلیاں تمباکو کی پتیوں میں بڑی آسانی سے اندر چلی جاتی ہیں۔ بچے چھ یا سات سال کی عمر سے کام کرنا شروع کر دیتے ہیں اور روزانہ دس یا بارہ گھنٹے مسلسل کام کرتے رہتے ہیں۔ ہفتہ میں کوئی چھٹی نہیں ہوتی اور اجرت کیا ملتی ہے قریباً دو آنے یومیہ۔ بچوں کے والدین کارخانہ داروں سے مقروض ہوتے ہیں اس لئے وہ مجبور ہوتے ہیں کہ بچوں کو کام پر لگائے رکھیں۔

صنعتی مزدور:۔ باقاعدہ صنعت میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد قریباً
پچاس لاکھ ہے۔ دراصل مزدوروں کی روزانہ اوسط تعداد ۳۵ لاکھ ہے جسے ایک
ماہر اقتصادیات نے اسطرح متعدد حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ۱۵ لاکھ کے لگ
بھگ کارخانوں میں ملازم ہیں۔ قریباً دس لاکھ چائے کے کھیتوں وغیرہ میں کام
کرتے ہیں ساڑھے سات لاکھ سے کچھ زیادہ ریلوے میں ملازم ہیں قریباً ۲½
لاکھ کانوں میں کام کرتے ہیں۔ ان مزدوروں میں دس لاکھ عورتیں بھی شامل ہیں
جن میں تقریباً ۲½ لاکھ فیکٹریوں میں کام کرتی ہیں۔ اور پانچ لاکھ کے لگ بھگ
۱۵ سال سے کم عمر کے بچے ہیں جن میں قریباً ۱۲ ہزار فیکٹریوں میں ملازم ہیں
مزدوروں کی خصوصیات کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان
صنعتی پختگی کی راہ پر گامزن ہے۔ یہاں کے مزدوروں کی زیادہ تعداد ابھی
یورپی معنوں میں پرولتاری نہیں بنی۔ کھیتی پر بوجھ اور پیداوار کی کمی کسانوں
کو شہروں کا رخ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ تقسیم در تقسیم اور قرضہ کے بے پناہ بوجھ
سے بعض کسانوں کی کھیتیاں برائے نام رہ جاتی ہیں۔ وہ اس مصیبت سے نجات حاصل
کرنے کے لئے شہروں میں پہنچتے ہیں اور وہاں کام کرنے لگتے ہیں۔ مگر فصل کاٹنے اور
بونے کا موسم ہو تو پھر گھر کا رخ کرتے ہیں۔ ان کسانوں کو موسمی مزدوروں کا
نام دیا جا سکتا ہے۔ دوسرے درجہ پر وہ مزدور ہیں جن کا دیہات سے رشتہ
منقطع ہو چکا ہے۔ اور جو اصطلاحی طور پر مزدور بن چکے ہیں زمین بک جانے یا
کسان کے زرعی مزدور بن جانے سے کسانوں کا دل کھیتی سے اچاٹ ہو جاتا ہے
اور وہ اپنے آپ کو گاؤں میں اس توقیر اور عزت سے محروم سمجھنے لگتا ہے جو مالک
کی حیثیت سے اسے حاصل ہوتی ہے۔ برادری میں عزت کھو کر کسان کے پاس کیا رہ جاتا
ہے۔ اور اسے گاؤں میں رہنے سے فائدہ بھی کیا ہے۔ جب وہ گاؤں کے اندر

معاملات اور پنچایتی جھگڑوں میں دخل دینے سے محروم ہو گیا ہو۔ ایسے کسان ، گاؤں سے شہر کا رخ کرتے ہیں۔ کسی کارخانہ میں ملازم ہو جاتے ہیں۔ اور ایک عرصہ بعد ہر اعتبار سے اصطلاحی مزدور کا نمونہ بن جاتے ہیں۔ ان کی رہائش ان کا بود و باش اور طرز تمدن اپنا ہی جداگانہ ہوتا ہے یہی وہ مزدور ہیں جنہیں پرولتاری کی اصطلاح سے موسوم کیا جاتا ہے۔

"اندرونِ یورپ" کے شہرۂ آفاق مصنف نے کارخانوں میں ملازم رکھنے والے ہیچولے کی نہایت خوبصورت تصویر کھینچی ہے۔ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی سے اس طرح آشنا ہو چکے ہیں کہ ہم اسے ناقدانہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے۔ یا عین ممکن ہے۔ اس کا باعث وہ عام رشوت ستانی کی روح ہو۔ جو ہندوستان کے ہر محکمہ میں پائی جاتی ہے۔ اور ہمارے لئے وہ اس قدر روزمرہ کی چیز ہو چکی ہے کہ ہم اسے محسوس نہیں کرتے۔ مختصر یہ ہیں کہ کارخانوں سے باہر کئی کاریگر مزدور موجود ہوتے ہیں یہ مزدور کارخانہ دار یا اس کے مینیجر اور امیدوار مزدور کے درمیان دلالی کا کام کرتا ہے وہ مزدور کو نوکر رکھنے کے عوض اس سے ایک رقم طے کرتا ہے۔ جو عموماً پہلے مہینہ کی تنخواہ یا تنخواہ سے کچھ فیصدی ماہوار پر مشتمل ہوتی ہے۔ اکثر حالتوں میں کام کی تلاش میں سرگرداں مزدوروں کو یہ رقم پیشگی ادا کرنا پڑتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ رشوت ستانی کا یہ سلسلہ یہیں ختم ہو جاتا ہے۔ انہیں ایک بار پھر مٹھی گرم کرنا پڑتی ہے۔ پھر ترقی کیلئے ہمیشہ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے۔ اسطرح بدنصیب مزدور کی تنخواہ کا ایک حصہ ہمیشہ کارندہ کی نذر چڑھتا رہتا ہے۔

۱۹۳۴ میں قانون کارخانہ جات نافذ ہوا جس کی رو سے کارخانوں کو دو جماعتوں میں تقسیم کیا گیا۔ اولاً وہ کارخانہ جات جو سال بھر کام کرتے رہتے ہیں۔ ان میں کام کرنے کا وقت ہفتہ میں ۵۴ گھنٹے ہے ثانیاً موسمی کارخانے اِن

کے لئے ہفتہ میں ۶۰ گھنٹے اوقات کار مقرر ہیں ۱۲ سال سے کم عمر کا بچہ کام پر نہیں لگایا جا سکتا۔ ۱۲ - اور ۱۵ سال کے بچوں کے لئے کام کا وقت ۵ گھنٹے روزانہ ہے۔

اگرچہ کارخانوں میں حالات دن بدن سدھر رہے ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قانون کے استعمال میں کافی تجاہل اور تساہل سے کام لیا جاتا ہے۔ کئی کارخانوں کا سرے سے معائنہ نہیں کیا جاتا اور اگر کہیں آجر کی شدید قانون شکنی کا سراغ ملتا ہے تو اس پر مقدمہ نہیں چلایا جاتا بغرض محال کہیں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے۔ تو سزا نہایت خفیف سی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں کئی کارخانے قانون کی زد سے باہر ہیں یہ قانون صرف ۱۵ لاکھ مزدوروں پر عائد ہوتا ہے جو باقاعدہ طور پر رجسٹرڈ کارخانوں میں کام کرتے ہیں

کان کی صنعت کی یہ حالت ہے کہ ۱۸-۱۹۱۴ کی جنگ عظیم سے قبل یہاں کسی قانون کو دخل حاصل نہ تھا۔ کام کے اوقات غیر معین تھے۔ مزدوروں کی حالت ابتر تھی۔ مزدور اس کی بیوی بچے زمین کی تہ میں چلے جاتے۔ وہاں کان میں کام کرتے۔ وہیں آرام کرتے۔ اور بعض حالتوں میں ۲۴ گھنٹوں سے بھی زیادہ لگاتار وہیں رہتے۔ کوئلہ کاٹ کاٹ کر تھک جاتے تو چند یوم کے لئے گاؤں میں چلے جاتے۔ لوٹ کر پھر وہی چکر چلنے لگتا۔ کانوں سے متعلق قانون نافذ ہونے کے بعد فیصلہ ہوا۔ کہ ۱۵ سال سے کم عمر بچے کانوں میں کام نہیں کر سکتے اور کانوں کے اندر سطح زمین سے نیچے کام کو ۹ گھنٹے یومیہ سے زیادہ نہیں پھیلایا جا سکتا۔ زمین سے اوپر کام کا وقت دس گھنٹے فی یوم مقرر ہوا اور ہفتہ میں ۵۴ گھنٹے۔

سطح زمین سے نیچے کام ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۹ء تک بتدریج تخفیف

کی بنا پر عورتیں نظر نہیں آتیں۔ کانوں میں شرح حادثات بہت زیادہ ہے
اس کا سبب یہ ہے کہ کانوں کے انتظامات میں مزدوروں کی حفاظت کا کوئی
خیال نہیں رکھا جاتا۔ کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ کہ ایک سرکاری رپورٹ نے اس
کے متعلق یوں لکھا "خطرات مول لئے جاتے ہیں مزدور قدرے باخبر
اور ہشیار ہوں تو ان خطروں کے امکانات میں کمی ہو سکتی ہے۔ کوئلہ کی کانوں میں مزدوروں
کی اوسط اجرت سات آنہ روزانہ ہے۔ کاریگر مزدور اوسطاً ۹ آنے روزانہ
حاصل کرتے ہیں غیر کاریگر ۷ آنہ اور عورتیں پانچ آنہ۔ یہ اجرتیں ۱۹۲۷ء کی
نسبت ۵۰ گنا کم ہیں۔ ابرق کی کانوں میں اجرتوں کی شرح اس سے بھی کم ہے"

"باترتیب صنعت میں ۵۰ فی صدی کے قریب مزدور کپڑے بننے کے
کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ اجرتوں کے نرخ بہت وسیع ہیں۔ مگر حسب
ذیل اعداد و شمار سے کم و بیش پوزیشن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ اعداد
جولاہوں سے متعلق ہیں جو سب سے زیادہ تنخواہ پاتے ہیں۔ احمد نگر کے کارخانوں
میں دو تکلوں پر کام کرنیوالے مزدور ۴۵ سے ۵۰ روپیہ ماہوار کما لیتے ہیں
دوسرے مقامات پر نرخ بہت کم ہیں۔ صوبجات متوسط میں دو تکلوں پر کام
کرنے والا مزدور ۳۰ روپیہ ماہوار اور ایک تکلہ پر کام کرنے والا ۱۵ روپیہ
ماہوار حاصل کرتا ہے۔ کانپور میں قریباً قریباً یہی کیفیت ہے۔ کموبتر میں دو
تکلوں پر کام کرنیوالا مزدور ۱۱-۲۵ روپیہ۔ اس سے آگے بڑھیں۔ تو دو تکلوں
پر کہیں ۲۵ اور ۳۰ روپے سے زیادہ نہیں ملتے۔ کلکتہ میں سن کے کارخانوں
میں جولاہے ۲۵ روپیہ ماہوار فی کس کے حساب سے بنا لیتے ہیں۔ مگر دوسرے
حصوں میں اجرتیں بہت کم ہیں اور اکثریت ۱۲ روپیہ ماہوار سے زیادہ حاصل
نہیں کرتی۔ اسی طرح صنعت کے سوت کاتنے کے حصے میں اجرتیں فی مزدور

دس روپیہ سے ۱۵ روپیہ کے درمیان ہیں۔ البتہ لنکا کے دوسرے حصوں میں اس سے کہیں زیادہ ہیں اوٹنے اور اور دبانے کی ملوں میں بھی اجرتوں کی یہی شرح ہے۔ حاصل کلام یہ کہ ایک طرف بڑی سے بڑی اجرت پانیوالے مزدور ۵۰ روپیہ ماہوار حاصل کرتے ہیں باقی تمام کی اجرتیں ہر جگہ ۸ر آٹھ آنہ یومیہ کے قریب قریب ہیں۔"

مندرجہ بالا حقائق کسی بحث و تبصرہ کے محتاج نہیں۔ وہ مزدوروں کے حالات کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ انگلستان کے بیکار مزدور کو ایک ہفتہ میں اتنا ہی روپیہ ملتا ہے جتنی ہمارے ہاں ایک نہایت کاریگر مزدور کی تنخواہ ہے۔ ان حالات میں مزدور اگر قرض اٹھا کر گزارا کرتا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ مزدوروں کی اکثریت مقروض ہے کسان کے پاس نام کی کھیتی تو موجود ہوتی ہے۔ مزدور کے پاس کوئی پس انداز نہیں۔ اولاً اسے نوکر ہوتے وقت دلال کی مٹھی گرم کرنے کے لئے قرضہ اٹھانا پڑتا ہے۔ ناگہانی ضروریات مثلاً شادی اور ماتم اسے ایک بار پھر ساہوکار کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کر دیتے ہیں بیکاری اور بیماری کا وقت کاٹنے کے لئے اس کے پاس کوئی اثاثہ نہیں ہوتا۔ چونکہ جو کچھ وہ روزانہ کماتا ہے۔ روٹی۔ دال کے خرچ پر صرف کر دیتا ہے اور ایسے مواقع پر وہ قرض اٹھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ بیچارہ عیش و عشرت کیلئے قرضہ نہیں اٹھاتا بلکہ تمام قرضہ آٹے دال کا ہے بغیر اس کے اس کا گزارا نہیں ایسے سامان تعیش کی بجائے اسکی بنیادی ضروریاتِ زندگی ہیں۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ اوسط قرضہ قریباً تین ماہ کی آمدنی کے برابر ہوگا

قرضہ بہت بھاری شرح سود پر اٹھایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مزدور کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جس کی ضمانت پر وہ قرضہ اٹھا سکے۔

ڈیپریشن ہوجانے کا خطرہ ہو تو ساہوکار زیادہ سے زیادہ نرخوں پر قرض دے گا۔ مرکزی ہندوستان میں سود خور پٹھان غریب مزدوروں کو نہایت ہی اونچے نرخوں پر قرضہ دیتے ہیں۔ روپیہ اور اس کی وصولی کے ان کے اپنے ہی ڈھنگ ہیں جنکی اجازت کوئی مہذب حکومت نہیں دے سکتی۔ سود کی اوسط شرح ۷۵ فیصدی ہے قرض خواہ اصل کا کم و بیش ہی مطالبہ کرتا ہے۔ اور نہ ہی اسے اس بات کی خواہش ہوتی ہے کہ مقروض اس کا قرض چکا دے۔ وہ صرف سود کا متمنی ہوتا ہے اسے اس سے زیادہ کسی سے سروکار نہیں۔ غریب مزدور ایک دفعہ مقروض ہوکر اپنے آپ کو کئی مصائب میں جکڑ لیتا ہے۔ وہ شریف شہری کی حیثیت کھو بیٹھتا ہے کیونکہ وصولیوں کے وقت اسے کئی ذلتوں اور بے عزتیوں کی آماجگاہ بننا پڑتا ہے۔ وصولیاں کبھی تشدد اور کبھی ڈراؤ دھمکاؤ سے ہوتی ہیں۔ یہ وصولیاں مزدور طبقہ پر بھاری بلا ثابت ہوتی ہیں۔ جن کی ادائیگی میں انہیں نہ صرف معمولی تفریح و آرام سے درگزر کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ عام طور پر وہ انہیں مقدم ضروریات زندگی سے کاٹ کر ادا کرتے ہیں ان تمام مصائب سے نجات حاصل کرنے کا مزدوروں کے پاس صرف ایک علاج ہے۔ سستا نشہ۔ عام مزدور سستی شراب اور تاڑی پیتے ہیں جو اُن کی صحت پہ نہایت مہلک اثر کرتی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ مزدور کے پاس تفریح کے صرف دو سامان ہیں عورت سے سستی عیاشی اور سستا نشہ

بے کاری ہمارے سماج میں ایک اور بڑی لعنت اور جدید سماج کی سب سے بڑی سوغات بیکاری ہے۔ اور بیکاری بھی ایسی کہ جس کی مثال مغربی دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ آج کی دنیا میں ہندوستان میں بلاشبہ بے کاری نظر نہیں آتی۔ لیکن یہ بات بالکل عارضی ہے جنگ کے بعد حالات

پھر وہیں کے وہیں آ جائیں گے جنگیں حادثات ہیں جن میں انسانی حیات اپنی عام حالت کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ یہاں ہمارا تعلق حادثات کے معمولی لمحات سے نہیں۔ ہمارے سامنے تو عام ہندوستانی زندگی ہے۔

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ پرانے دیہاتی نظام کی تباہی نے ہندوستان کی مجلسی حالت کو تہ و بالا کر دیا صنعت اور کھیتی کے اس رشتہ کے ختم ہونے سے جو صدیوں سے ان میں قائم تھا زمین بُری طرح انسانی بوجھ تلے دب گئی اور کسان جو اس سے پیشتر اپنا بیشتر وقت گھریلو صنعت پر صرف کر لیتا تھا۔ بیکار ہو گیا۔ آج بازاروں میں جو موسمی مزدور نظر آتے ہیں یہ اسی سماجی بحران کی پیداوار ہیں وہ اپنا بے کار وقت شہروں میں محنت مشقت پر کاٹنا چاہتے ہیں۔ کسانوں کی بیکاری سے متعلق اعداد و شمار یک زبان نہیں اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ کسان سال میں چھ سے نو مہینے کے درمیان بیکار رہتا ہے۔

یہاں تعلیم یافتہ لوگوں کا ذکر کر دینا بھی بے محل معلوم نہیں دیتا۔ کیونکہ ان لوگوں کی اکثریت نیم متوسط طبقہ سے تعلق رکھتی ہے جنکے مسائل حیات سادہ لوح کسانوں اور ہوشیار مزدوروں سے بھی زیادہ پیچیدہ ہیں۔ غریب گھرانوں کے پڑھے لکھے نوجوان جسمانی محنت کے قابل نہیں رہتے۔ دفتروں میں نوکریاں محدود ہوتی ہیں۔ اس لئے اس کا لازمی نتیجہ بے کاری ہے جنگ سے قبل۔ معمولی معمولی نوکریوں کے لئے ہزاروں درخواستیں پہنچ جاتی تھیں۔ جبکہ ان اسامیوں کے لئے محدود سے چند آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ مدراس میں امتحان کے طور پر دو دفتری کلرکوں کی اسامیوں کا اشتہار لگا دیا گیا۔ تنخواہ ۳ پونڈ ماہوار تھی پہلی ملازمت کے لئے ۴۴۴ اور دوسری اسامی کے لئے ۸۷، درخواستیں آئیں۔ اس کا باعث نظام تعلیم ہے جنگ کے دوران

میں چند محکمے ایسے کھل گئے۔ جہاں میٹرک پاس طلباء کو ٹکنیکل تعلیم دی جاتی ہے۔ کیا ہی بہتر ہوتا۔ اگر اس امر کی طرف یونیورسٹیوں نے خود توجہ دی ہوتی۔
کارخانوں اور دفتروں میں ۱۹۳۰ء کے اقتصادی بحران کے بعد تخفیف کا دور دورہ شروع ہوا۔ اس سے پیشتر بیکاری کا مسئلہ اس قدر شدید نہ تھا۔ اس کے بعد مزدوروں اور پڑھے لکھے لوگوں کی بیکاری عام ہوگئی اور اب یہ مسئلہ اتنی بھاری اہمیت بن گیا ہے کہ صوبائی حکومتیں اس کی طرف توجہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ حکومت پنجاب نے بیکاری کے اسباب کی تحقیق اور اس کے سد باب کے ذرائع سوچنے کے لئے ایک کمیٹی نامزد کی تھی۔ مگر عام کمیٹیوں کی طرح یہ بھی بیانات شایع کرنے کے بعد معدوم ہوگئی۔

بے کاری کا مسئلہ ہندوستان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے لیکن اس کا حل معمہ نظر آتا ہے۔ چونکہ بڑے لوگوں کو اس سے دلچسپی نہیں پرجا بے زبان ہے۔ غریبوں کا خدا حافظ ہے۔

عوام کی حالت

موجودہ جنگ کے اثرات

ہندوستان انگریزوں کا غلام ہے اس لئے اس کی کرنسی اور
روپیہ کی بناوٹ اور تقسیم انگریزی طریق تبادلہ یعنی پونڈ سٹرلنگ کی
دم کے ساتھ بندھی ہوئی ہے ہندوستانی روپیہ کی کمی یا کثرت بھی برطانوی
مفاد کے مطابق ہی طے کی جاتی ہے۔ جیسے ہم تمام نرکا رو بار روپیہ کی گنتی
سے کرتے ہیں اور جو حیثیت ہندوستان کی اقتصادی حالت میں روپیہ کی
ہے وہی حالت انگلستان میں پونڈ کی ہے۔ مگر پونڈ کی حیثیت تو اس ڈاکو
ایسی ہے جس نے اپنے گروہ میں بہت سے انسانوں کو خوف زدہ کر کے
شامل کر لیا ہو۔ اور جب چاہئے انہیں اپنے حلقہ کے لئے استعمال کر سکے۔ عموماً
ان "ساتھیوں" کو کسی دوسرے ڈاکو سے لڑنے یا لوٹنے یا اپنے
میں سے کسی ساتھی نے بغاوت کر دی ہو تو اسے لوٹنے کے کام میں لایا جاتا ہے
جس طرح اس جنگ سے یا پہلی جنگ عظیم سے پہلے انگلستان آدھی دنیا پر
حکومت کرتا تھا۔ اسی طرح پونڈ دنیا کی آدھی مالیت پر نہ صرف قابض
تھا بلکہ اس کے باہر بھی دوسرے ملکوں کی مالی حالت پر بھی اثر پذیر ہوتا
تھا۔ لندن اس ڈاکو کی جو لانگاہ تھی۔ جس میں کئی نقب اور ظاہراً ادارے تھے
جو دوسروں کی جیب سے روپیہ پیسہ اسطرح نکال لیتے تھے کہ جیسے کوئی
مقناطیسی اوزار ان کے پاس ہو۔ گو آج اس بوڑھے ڈاکو کو ایک نئے

ڈاکو نے کئی بار شکست دی ہے۔ اور نیا ڈاکو اپنے قدم ہر جگہ بڑی مضبوطی سے جما رہا ہے۔ مگر پھر بھی بوڑھا ڈاکو آج اپنی پہلی حالت کو مستحکم کرنے کیلئے بہت بے تاب ہے۔ ان دو لٹوں میں شناخت اس بات سے کی جا سکتی ہے کہ بوڑھے ڈاکو کے چہرے پر ایک کھڑی سی خراش ہے اور نئے ڈاکو جس کا مسکن نئی دنیا میں ایک مقام نیو یارک میں ہے کے چہرے پر دو گول گول نہ مٹنے والے نشان ہیں اسے لوگ ڈالر کے نام سے پکارتے ہیں پھر بھی اس کا کوئی زبردست ڈاکہ ہندوستان پر نہیں پڑا۔ مگر ہمارے ہمسایہ ملکوں خصوصاً۔ آدھے چین کو وہ ہڑپ کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے

انگریزوں کے ہندوستان میں آنے کے وقت ملک میں کوئی ایسا سکہ رائج نہ تھا جسے سارے ملک میں بدلِ اشتراک کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ملکہ وکٹوریہ کی تصویر چھاپ کر ہندوستان بھر میں ایک نئے سکہ جسے ہم روپیہ کے نام سے منسوب کرتے ہیں چلایا گیا۔ ۱۸۹۳ء تک ایک روپیہ میں جتنی چاندی ہوتی تھی۔ روپیہ کی قیمت اسی چاندی کے مطابق ہوتی تھی۔ یعنی بازار میں آپ اگر ایک روپیہ سے جس پر کہ سرکاری مہر لگی ہو ۱۶ چیزیں خرید سکتے ہیں۔ ۱۸۹۳ء میں جب دنیا کے ہر ملک میں چاندی کی اصلی قیمت گر گئی۔ تو ہندوستان پر بھی اس کا اثر پڑا۔ اس لئے ۱۸۹۳ء کے بعد چاندی ایک روپیہ کی مالیت کی نہ ہوتی تھی۔ بلکہ اس سے کم ہوتی تھی۔ اس کمی کی جگہ سکہ بھر دیا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ چاندی کی بین الاقوامی حیثیت کم ہو جانے سے اور سونے کے مضبوط طاقت پکڑ لینے سے سارے روپیہ کی چاندی اور بھی کم ہو گئی۔ یہاں تک کہ آج اس میں صرف ۶ پیسے کی چاندی ہے

یہ ہے روپیہ کی بناوٹ کا مسئلہ آپ سنئے۔ اس کے پھیلاؤ ۔۔۔

—— کی داستان ہندوستان کی تجارت، صنعت، زراعت اور روزانہ کاروبار میں کتنے روپوں کی ضرورت ہوتی ہے حکومت کو اس بات کی فکر نہ تھی۔ انگلستان میں ہندوستانی کونسل جو عموماً انگریز اور سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا کے بالواسطہ ماتحت ہوا کرتا تھا۔ دوسرے ملکوں سے ہندوستان کی تجارت کی بنا پر اس بات کا فیصلہ دیا کرتا تھا کہ کتنا نیا روپیہ ٹکسال میں بنایا جائے اس پر عموماً برطانوی مفاد کا اثر پذیر ہونا نہایت لازمی تھا۔ اس لئے عموماً روپیہ کی تقسیم برطانوی تجارت اور پونڈ کی بڑھتی یا گھٹتی قیمت سے ہی طے ہوتی تھی ۱۹۳۵ء میں ریزروبنک آف انڈیا کے عمل میں آنے پر یہ امید کی گئی تھی کہ وہ بھی دوسرے ملکوں کے مرکزی بنکوں کی طرح ہماری صنعت اور تجارت کو اندرونی اقتصادی ضروریات کے مطابق ....

..... ہندوستان کے مفاد کو مدنظر رکھ کر مضبوط بنائے گا۔ مگر جہاں ریزروبنک انڈیا ایکٹ کے ماتحت گورنمنٹ کو نئی کرنسی پالیسی بنانے کی تجویز پیش کر سکتا تھا۔ اور نئے حالات میں اپنی سفارشات پیش کر سکتا تھا۔ وہاں اس نے صرف حکومت کے جائز اور ناجائز حکم کی تعمیل کرنا ہی اپنا فرض سمجھا۔ بہرحال اب نوٹ حکومت کے بجائے بنک جاری کرنے لگا۔ اور باقی روپیہ اور چھوٹے سکے حکومت جاری کرتی تھی

موجودہ جنگ میں ریزروبنک نے نہ صرف اتحادی ملکوں کے اخراجات کے لئے بے انتہا نئے نوٹ چھاپ کر ان کے حوالے کئے۔ بلکہ اس بات سے بالکل بے بہرہ رہا۔ کہ اس کا اثر ملک کی قیمتوں کے اضافہ پر کیا ہوتا ہے اور عوام الناس اس کی لپیٹ میں کس طرح آتے ہیں حکومت ظاہرا ہندوستان کو لوٹنے کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئی۔ اور بنک ایک ایسا

ذریعہ بن گیا جس سے وہ اپنا ہر مطلب پورا کر سکتی تھی۔ جب ریزرو بنک آف انڈیا ایکٹ پاس ہوا تھا۔ تو اس وقت یہ طے پایا تھا۔ کہ کاغذ کے جتنے نوٹ بنک چھاپ کر جاری کرے ان کے کم سے کم چالیس فیصدی حصہ کی مالیت کا سونا۔ یا برطانوی بونڈ ضمانت کی شکل میں بنک کی الماریوں میں رکھا جائے۔ اب یہ برطانوی پونڈ کی ضمانت کیا بلا ہے اس کو ہم اگلے پیرے میں بیان کریں گے۔ مگر یہ کاغذ کی ضمانتیں جنکے عوض کاغذ کے نوٹ ہندوستان میں جاری کئے گئے۔ اتنی حد تک بنک کی الماریوں میں جمع ہو گئیں کہ کہاں وہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں تقریباً ۶۰ کروڑ روپیہ کی مالیت کی تھیں اور کہاں وہ جنوری ۱۹۴۵ء میں ۹۳۰ کروڑ روپیہ کی ہو گئیں اور اگست ۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہو جانے کے بعد ان کے عوض ہندوستان میں برطانوی ضروریات پوری کرنے کے لئے کاغذ کے نوٹ جاری ہوتے تھے ۱۹۴۶ء کے شروع میں ان کی مالیت تقریباً ۱۱۰۰ کروڑ روپیہ کی تھی ذرا اس کا تناسب سونے اور چاندی اور حکومت ہند کے روپیہ کی ضمانتوں سے کیجیئے (جن کو آگے چل کر تفصیل سے بیان کیا جائیگا) جو بنک کی الماریوں میں رکھی گئیں تھیں۔ یکم ستمبر ۱۹۴۵ء کو بنک کے پاس تمام کاغذ کے نوٹوں کے عوض ۳۵ فیصدی چاندی یا چاندی کے سکے تھے۔ ۲۰ فیصدی سونا تھا۔ ۲۸ فیصدی پونڈ سٹرلنگ کی ضمانتیں تھیں۔ اور ۱۷% روپیہ کی ضمانتیں تھیں۔ یکم جنوری ۱۹۴۶ء کو سٹرلنگ ضمانتیں ۹۰ فیصدی ہو گئیں۔ سونے اور چاندی کا ۷ فیصدی سے کم اور روپیہ کی ضمانتیں ۳ فیصدی سے بھی کم۔ یہ تھی بنک کے انتظام میں ابتری۔ یہ تھا بنک جو عوام کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ جس نے خود

کا خون چوسنے میں حکومت کا اچھی طرح ساتھ دیا۔ اس نے عوام کا خون کیسے چوسا یہ ہم آگے چل کر بتائینگے۔ اس کے ساتھ ایک اہم ضروری بات نہ بھولنی چاہیئے۔ وہ یہ کہ اس کی انتظامیہ کمیٹی کے ۱۶ ممبروں میں ما سوائے ایک آدھ کے سب کے سب ہندوستانی ہیں اور ان میں سے تقریباً ۸ کا حصہ دار انتخاب کرتے ہیں۔ لیکن تمام کے تمام ہندوستان کے بڑے بڑے سرمایہ دار ہیں کانگرس اور لیگ کو بھی دل کھول کر روپیہ دیتے ہیں۔ اپنے آپ کو ملک کے اقتصادی بدحالی کے غم میں گھلتا ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی جیبیں مزدوروں اور کسانوں اور عام شہریوں کے اس چوسے ہوئے خون کی قیمت سے بھری پڑی ہیں جو ان کے جسم سے نچوڑا گیا ہے اور باقی اب صرف ہڈیاں ہی ہڈیاں نظر آتی ہیں۔

اب ذرا سٹرلنگ ضمانتوں کے جادو کے تماشہ کو بھی دیکھ لیجیئے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ انگلستان میں طریق تبادلہ پونڈ ہے یعنی پونڈ کے ذریعہ سارا کاروبار ہوتا ہے۔ آپ کے پاس قیمتی جائداد یا نقد ہی پونڈ کی شکل میں بیان کی جاتی ہے اور چیزوں کی قیمتیں بھی پونڈ میں بتائی جاتی ہیں۔ اگر پونڈ تباہ ہو جائے تو لاکھوں کا بیوپار کرنیوالے ایک منٹ میں تباہ ہو جائیں گے۔ اس کا پورا نام پونڈ سٹرلنگ ہے یا یوں کہیئے کہ سٹرلنگ بھی پونڈ کا ہی نام ہے۔ اب ضمانت کیا ہوتی ہے یہ بھی سن لیجیئے۔ یہ ایک حکومت کا چھپا ہوا کاغذ ہے جس پر سرکاری مہر ثبت ہوتی ہے اس پر تین الفاظ لکھے ہوتے ہیں جو انگریزی کے تین حروف ہیں انکے نام آئی۔ او۔ یو (I.O.U) ہیں۔ یہ انگریزی کا ایک فقرہ ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ "میں نے آپ کو ادا کرنے ہیں" اس کے ساتھ اس پر مخصوص رقم بھی چھپی ہوتی ہے ۱۰۰ پونڈ ہو یا ایک لاکھ

پونڈ یعنی ۱۰۰ روپیہ کی ہو یا ایک لاکھ روپیہ کی۔ اب یوں سمجھ لیجیئے کہ آپ بازار کے کسی بااعتبار اور معتبر بینکر یا کمیشن ایجنٹ کی کوئی ہنڈی اس جگہ کے کسی بھی بنک کو دے کر نقدی حاصل کر سکتے ہیں کیوں کہ بنک کو ان ساہوکاروں وغیرہ پر اعتبار ہوتا ہے اب حکومت پر تو ہر آدمی اور ہر بنک کو اعتبار ہوتا ہی ہے۔ چاہے وہ اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو وہ سو فیصدی اعتبار کے قابل ہوتے ہیں۔ چونکہ نوٹ چھاپنے اور جاری کرنے کا حق صرف مرکزی بنک کو ہوتا ہے اس لئے وہ انکو اپنے پاس رکھ کر کاغذ کے نوٹ بازار میں حکومت کے ذریعہ بھیجتے ہیں۔ اب جب جنگ شروع ہوئی تو جنگی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے حکومت کو روپیہ کی ضرورت تھی۔ اور مشرق بعید کی جنگ لڑنے کے لئے امریکہ اور انگلستان کی فوجوں کے قیام وطعام اور گولہ بارود کے لئے بھی روپیہ کی ضرورت تھی۔ ہندوستان کے تمام ذرائع کو جنگ میں دھکیلنے کے لئے انہیں خریدنا ضروری تھا اس کے لئے کاغذ کے نوٹ بھی ناکافی تھے۔ اب اتنے کروڑ روپیہ حکومت ٹیکس اور لوگوں سے ادھار تو لے نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ نہ تو اتنا روپیہ لوگوں کے پاس تھا۔ اور نہ ہی وہ اس ناکارہ اور بیرونی حکومت کو روپیہ دینے کیلئے تیار تھے۔ اس لئے نومبر ۱۹۳۹ء میں حکومت برطانیہ اور حکومت ہند میں ایک مالی معاہدہ ہوا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ جو اخراجات ہندوستان کے بچاؤ پر خرچ کئے جائیں گے انہیں حکومت ہند برداشت کرے۔ اس کے لئے تمام روپیہ حاصل کرنے کی وہ خود کوشش کرے اور جو اخراجات برطانوی اور باقی اتحادی ملکوں کی خاطر یہاں کئے جائیں ان کے لئے حکومت برطانیہ کی سٹرلنگ ضمانتوں کے عوض ریزرو بنک

آف انڈیا سے روپیہ حکومت برطانیہ کو ادھار دیا جائے (یہ بات پہلے واضح کردی گئی ہے کہ ریزرو بنک سونے یا سٹرلنگ سیکورٹیز کے عوض روپیہ کے نوٹ جاری کرسکتا ہے۔ اب جو ضمانتیں حکومت برطانیہ کی تھیں ان کو سٹرلنگ ضمانتیں اور جو حکومت ہند کی ضمانتیں تھیں ان کو روپیہ ضمانتیں کہا جاتا ہے۔ ان کی تعداد جیساکہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ ہندوستان کی اپنی حیثیت اور اہلیت سے کہیں زیادہ تھی۔ جس کی وجہ سے ہمارے ملک میں قیمتیں حد سے زیادہ بڑھ گئیں اور غریب مزدوروں اور کسانوں کے لئے یہ بھی مشکل ہوگیا کہ وہ اپنی کھانے پینے کی ضروریات بھی پورا کرسکیں۔ جنگ کے خاتمہ پر سٹرلنگ ضمانتیں تقریباً ۱۱۰۰ کروڑ روپیہ کی مالیت کی ہوگئیں اور روپیہ ضمانتیں ۶۰ کروڑ روپیہ کیں۔

کاغذ کے روپیہ کے اتنے نوٹ پہلے کبھی ہندوستان میں جاری نہ کیے گئے تھے ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں اور اس سے پیشتر بھی کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ اس کا اثر ہندوستان پر اسقدر بھیب ہوا کہ ہندوستان کی تاریخ میں اسکی مثال ملنا مشکل ہے۔ ہندوستان میں غلہ کی قلت بہت زیادہ تھی۔ برما کا چاول بند ہوجانے سے اور فصلوں کے تباہ ہوجانے سے غلہ کی قلت اور بھی زیادہ ہوگئی۔ مگر وسط مشرق میں اور ہندوستان میں مقیم برطانوی اور امریکن فوجوں کے لئے بھی روٹی ہندوستانی عوام سے چھین کر ان کے حوالے کردی گئی۔ ہندوستانی کپڑے کی ملوں کا کپڑا بھی ننگے ہندوستان کو اور زیادہ ننگا کرنے کیلئے باہر ملکوں میں بھیجا جاتا رہا۔ ان دونوں چیزوں کی قیمتیں اس قدر بڑھ گئیں کہ ان کی اجرتوں سے صرف زندہ رہنا بھی مشکل ہوگیا۔ قحط بنگال اور چاٹگانگ وغیرہ علاقہ جات کے لوگوں کا برسوں کپڑے سے محروم

رہنا کاغذ کے نوٹ کا کرشمہ تھا۔ تمام مجلسی ڈھانچہ کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ ایک اور اہم نتیجہ اس کا یہ بھی نکلا کہ غریب اور زیادہ غریب ہو گئے اور امیر بہت زیادہ امیر۔ اس کے ساتھ ایک ایسی نئی جماعت کا آغاز ہوا۔ جسے ہم اعلےٰ پیشہ ور طبقہ کا نام دے سکتے ہیں یعنی ٹھیکیدار وغیرہ جنکے پاس روپیہ اتنی بہتات سے اکٹھا ہو گیا کہ جس کا اندازہ ان کے دماغ میں بھی کبھی نہ تھا۔ رشوت ستانی۔ دھوکہ۔ جھوٹ تمام ذرائع سے روپیہ پیدا کرنے کی کوششیں کی گئیں اور حکومت اپنی ضروریات حاصل کرنے کی خاطر اندھا دھند روپیہ پانی کی طرح بہاتی رہی۔ بدعملی کی یہ حالت ہے کہ ہندوستانی شراب کی کھپت جنگ کے دوران میں دوگنی ہے۔ اب جب جنگ کے خاتمہ پر حکومت کی ضروریات میں کمی واقع ہو گئی ہے تو امراء جنگ کے دوران میں کمائی ہوئی دولت پر عیش کرنے کے سامان ڈھونڈ رہے ہیں۔ دوسری طرف عوام ہیں جو معمولی ضروریاتِ زندگی تک سے محروم ہیں۔ متوسط طبقہ کا تو اس جنگ نے صفایا کر دیا ہے۔ اسے از سرِ نو زندہ ہونے میں دقت لگے گا۔ ممکن ہے کہ کوئی زبردست اقتصادی پھیر اگر تمام سیاسی۔ اقتصادی اور مجلسی ڈھانچہ کو ایک ایسا ہلا دے جس سے لوگوں کے دماغ صحیح طریقہ سے سوچ سکیں۔

اب ذرا روزمرہ کی تبدیلیوں کی طرف آیئے جنگ کے شروع میں لوگوں میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا۔ کہ وہ نوٹوں کو چاندی کے روپوں میں تبدیل کر کے اپنے پاس جمع کرنے لگے۔ اسکی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ برطانوی فوجوں کی پے در پے شکستوں اور ہٹلر کی فوجوں کے بے تحاشہ قبضے سے لوگوں میں انگریزی حکومت کی مضبوطی میں اور بھی شک ہو گیا۔ ہندوستان جنگ کے کسی شعبہ میں بھی حکومت کے ساتھ محب الوطنی کے جذبہ سے تعاون نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ برسوں

کے تلخ تجربہ نے ایسے ایسے جیبت ہندوستانیوں کے منہ پر لگائے کہ وہ اس
حکومت کے خاتمہ کو بہتر سمجھتے تھے اور یہاں تک کہ وہ فسطائیت کے خطرہ کو بھی
بھول گئے۔ یہ سب برطانیہ سے نفرت کے جذبہ کی بدولت ہوا۔ جب چاندی
کے روپوں کی مانگ بڑھ گئی تو شروع شروع میں ریزرو بنک آف انڈیا نے
بلا روک ٹوک کاغذ کے نوٹوں کی جگہ چاندی کے روپے دینے شروع کئے مگر یہ
بات خود بنک کی سمجھ سے باہر تھی کہ اسے کہاں تک اس کام میں کامیابی ہو
سکتی ہے کیوں کہ ملک میں اس قسم کا خوف و ہراس تھا۔ کہ لوگوں کی تمام ضروریات
زندگی کو پورا کرنا مشکل ہو گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ یکم ستمبر ۱۹۳۵ء کو بنک کے پاس
۷۵ کروڑ ۶۷ لاکھ چاندی کے روپے تھے۔ مگر ۱۲ جون ۱۹۴۰ء کو صرف ۳۵ کروڑ
رہ گئے۔ اسی خطرہ کا سامنا کرنے کیلئے ۲۵ جون ۱۹۴۰ء کو یہ حکم جاری کیا گیا کہ کوئی
اپنی ضرورت سے زیادہ چاندی کے روپے اپنے پاس ذخیرہ نہیں کر سکتا۔ اس
لیئے چاندی کے روپوں کی مانگ تو کم ہو گئی مگر ریزگاری کی طلب میں ازلس اضافہ ہوا
جب چھوٹے سکوں کی مانگ بڑھ گئی تو لوگوں نے اشد ضرورت کے وقت تکلیف
سے بچنے کیلئے اور کچھ منافع خوروں نے اس سے فایدہ اٹھانے کی خاطر
چھوٹے سکوں کو اپنے پاس جمع کرنا شروع کیا۔ بڑے بڑے شہروں میں
دکانداروں۔ ہوٹلوں والوں۔ پان سگرٹ فروشوں نے غرضیکہ ہر اُن کاروبار
کرنے والوں نے جو چھوٹے سکوں کو کام میں لاتے تھے۔ دکانوں کے باہر بورڈ لگا
دیئے کہ دکان کے اندر تب آیئے اگر آپ کی جیب میں چھوٹے سکے ہوں۔ اس
سے غریب مزدوروں کو بہت دقت ہوئی۔ کیونکہ انہوں نے ایک۔ ایک دو
دو پیسہ کی اشیا خریدنی ہوتی تھیں جب بڑے بڑے اور متوسط درجہ کے
لوگوں کو تکالیف پیش آئیں تو مزدوروں کی مصائب کے کیا کہنے۔ ریزرو بنک

آف انڈیا کے دفاتر کے سامنے بڑے بڑے شہروں مثلاً بمبئی۔ کلکتہ۔ لاہور دہلی وغیرہ میں لوگوں کی قطاریں کی قطاریں کھڑی نظر آتیں کہ وہ کچھ نوٹوں کے عوض چھوٹے سکے حاصل کر سکیں۔ ریزرو بنک دو روپیہ سے زیادہ کے سکے کسی کو نہیں دیتا تھا۔ مگر پھر بھی ایک روپیہ کی خاطر ۱۲ ار کے سکے لوگ بیچتے اور کچھ لوگوں نے اسے اپنا پیشہ بنالیا۔ بڑی بڑی دکانوں اور ہوٹل والوں نے اپنے کوپن شائع کرنے شروع کر دیئے۔ اس مشکل کا سامنا کرنے کیلئے حکومت نے ڈیفینس آف انڈیا ایکٹ کی رو سے چھوٹے سکوں کو اصل قیمت سے زیادہ نرخ کی خرید وفروخت کو بالکل ممنوع قرار دیا۔ اور اپریل ۱۹۴۳ء کے حکم کے مطابق اپنی ذاتی یا تجارتی ضروریات سے زیادہ چھوٹے سکے پاس رکھنا جرم قرار دیا گیا۔ لیکن صرف حکم نافذ کر دینے سے حالات کیسے سدھر سکتے تھے لوگوں کا کرنسی پر اعتبار اٹھ چکا تھا۔ اس لئے ہر آدمی سکہ کی اصلی قیمت کو اپنے پاس ہی رکھنا چاہتا تھا بہرحال حکومت نے لوگوں میں اعتبار بڑھانے کی خاطر سکے زیادہ تعداد میں ٹکسال میں بنانے شروع کئے۔ اس کے علاوہ پرانے سکوں کے ساتھ ساتھ نئے سکے بھی جاری کئے گئے۔ سکوں کی اتنی ضرورت تھی۔ اور حکومت اس تیزی سے بنا رہی تھی کہ صرف ۴۳-۱۹۴۲ء میں ۱۰۰ کروڑ سکے بنائے گئے۔ اور زیادہ سکے بازار میں بھیجنے سے کچھ حالت سدھر گئی۔ مگر چونکہ سکوں کی قیمت ان میں لگائی ہوئی دھات سے کم ہوتی تھی اسلئے لوگ انہیں گرم کر کے ڈھال لیتے اور زیادہ قیمت پر بیچ دیتے۔ اس بات سے باز رکھنے کے لئے ۱۹۴۲ء میں ایک نئی قسم کی دوانی (چھوٹا سا ٹکہ) بازار میں لائی گئی۔ یہ سب سکوں سے چھوٹی تھی۔ اس کے ساتھ ایک نئی قسم کا پیسہ جاری کیا گیا جس میں کافی بڑا سوراخ تھا۔ لوگوں نے اس پیسے کو مشینوں میں واشل کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا۔ بہرحال کروڑوں

کی تعداد میں نئے سکے جاری کرکے حکومت اس وقت کو دور کرنے کے قابل ہو گئی۔

جب شروع شروع میں لوگوں نے نوٹوں کی جگہ چاندی کے روپے جمع کرنے شروع کر دیئے تو اس کے ساتھ ہی ان میں ایک اور رجحان بھی پیدا ہونے لگا۔ وہ یہ کہ لوگوں نے بنکوں سے روپے نکلوانے شروع کر دیئے۔ صرف ایک دن میں تین تین کروڑ روپیہ بنکوں سے روزانہ نکلوایا گیا۔ لیکن بعد میں بنکوں پر پبلک کا اعتبار بیٹھ جانے سے یہ حالت بھی دور ہو گئی۔ اب جب لوگوں کے ہاتھ میں روپیہ بہت آگیا۔ کیونکہ کاغذ کے نوٹ بہت تعداد میں جاری ہو رہے تھے۔ تو یہ ضروری امر تھا کہ لوگ بنکوں میں اپنا روپیہ جمع کرانے اس کے ساتھ ساتھ تجارت وغیرہ کے بڑھ جانے اور جنگ کی وجہ سے بیکاری کے دور ہونے اور نئے نئے کام اور کچھ صنعتیں شروع ہونے سے لوگوں کو روپے کی ضرورت بھی زیادہ پڑنے لگی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے نئے بنک کھلنے شروع ہو گئے بنکوں کی تعداد پہلے کی نسبت کہیں دوگنی سہ گنی ہو گئی۔ اب ان نئے کھلے ہوئے بنکوں کے متعلق بہت سے شکوک پیدا ہو گئے ہیں۔ کئی اقتصادی ماہر مثلاً ڈاکٹر ایل۔ سی جین کا خیال ہے کہ بنک جنگ کے دوران میں ایسی ایسی باتیں کر رہے ہیں جو ایک اچھے بنک کو نہیں کرنی چاہئیں۔ وہ کم سود پر روپیہ قرض دیتے رہے ہیں۔ اور ان کے اصلی قسم کے خزانے بہت کم ہیں۔ اس لئے ان کے فیل ہو جانے کا خطرہ ہے۔ دوسری طرف ڈاکٹر مہاجن کا خیال ہے۔ کہ ہندوستان کی صنعت۔ زراعت۔ آبادی اور تجارت کے لحاظ سے پہلے بنکوں کی تعداد بہت قلیل تھی۔ اس لئے یہ بنک فیل نہ ہونگے اور آئندہ ہندوستان میں صنعت اور تجارت کے بڑھنے کے امکان ہیں۔ اس لئے یہ بنک

پہلے کی طرح جنگ کے بعد بھی ترقی کریں گے مگر ایک بات صاف اور واضح ہے
کہ موجودہ اقتصادی نظام کا ایک ہلکا سا دھکا بھی ان بنکوں کو جڑھوں
سے اکھیڑ دے گا۔ موجودہ اقتصادی نظام میں اس قسم کے حالات کا
پیدا ہونا ایک ضروری امر ہے۔

یہ بات پہلے واضح کر دی گئی تھی کہ پونڈ کی ضمانتوں اور روپیہ
کی ضمانتوں کے عوض ریزرو بنک نے نوٹ جاری کرنے میں ذرا بھی
دریغ نہیں کیا۔ ہر قسم کے نوٹوں کی تعداد میں تقریباً ۵۰۰ فیصدی
سے زیادہ اضافہ ہوا۔ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو ان کی تعداد ۱۷۲ کروڑ
روپیہ کی مالیت کی تھی۔ مگر جنگ کے خاتمہ پر تقریباً ۱۱۰۰ کروڑ سے بھی
بڑھ گئی۔ اور اس کے بعد بھی سٹرلنگ ضمانتوں کے عوض نئے نوٹ جاری
ہوتے رہے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے اقتصادی ماہر حکومت کو اسکے
متعلق خبردار کرتے رہے اب جبکہ جنگ ختم ہو چکی ہے۔ پونڈ ضمانتوں
کے عوض نوٹ جاری کرنا ہندوستانی مفاد کے سراسر منافی ہے۔ مگر حکومت
ہند ہمیشہ برطانوی مفاد کو ترجیح دیتی رہی ہے۔ اور ہندوستان کی بھوک
و افلاس سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ ہندوستان میں سونے کی پوزیشن
کو مضبوط کرنے کے لئے ریزرو بنک کے خزانوں میں پونڈ جیسی مضبوط کرنسی
کو جگہ دی گئی مگر حکومت برطانیہ نے اپنی سیاسی مصلحت اور اس سود مند
اقتصادی حالت سے ناجائز طریقہ سے فائدہ اٹھایا۔ اور ہندوستان کی
کرنسی کو ایک مفلسی کی حالت میں چھوڑ دیا۔ اگر برطانیہ سیاسی طور پر ہندوستان
پر مسلط رہے تو بھی اسے ہندوستان کی اقتصادی حالت کے پیش نظر بیس اور تیس
فی صدی کے درمیان سٹرلنگ ضمانتوں کو بنک کے خزانوں میں داخل کرتے

کی اجازت نہیں دینی چاہیئے۔ مگر جب ایک لاغر جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کیئے جا رہے ہوں۔ تو جلاد کو یہ فکر نہیں ہوتی کہ جسم کے ایک حصہ کو کاٹنے سے دوسرے حصہ پر کیا اثر پڑے گا۔ اسے تو خون بہانا ہے۔ اور اس میں برطانیہ کو کافی مہارت حاصل ہے۔

یہ اقتصادیات کا ایک سیدھا سادا اصول ہے کہ اگر روپیہ کی ملک میں زیادتی ہو جائے اور اس کے ساتھ ساتھ پیداوار بھی اسی تناسب سے بڑھے تو ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے کچھ عرصہ کے لیئے اقتصادی بحران میں وقفہ ہو جاتا ہے مگر ہندوستان میں بہت کم پیداوار بڑھی۔ کئی شعبوں میں کم ہو گئی۔ تقریباً ۲۰ فیصدی ترقی کی امید کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر اس میں سے وہ اخراجات نکال دیئے جائیں۔ جو ہماری قیمتوں کے زیادہ ہونے سے آئیں گے۔ تو یہ ترقی نقصان میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس کے مقابلے میں۔ انگلستان کی پیداوار تقریباً ۶۰ فیصدی بڑھی اور امریکہ میں سو فی صدی
ہندوستان میں پیداوار کے نہ بڑھنے سے قیمتوں میں حیرت انگیز اضافہ ہوا مثلاً کلکتہ انڈکس نمبر کے اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ قیمتیں ۳۵ اور ۴۰۰ کے درمیان بڑھیں اس میں وہ قیمتیں شامل نہیں جو انسان کو چند اشد ضروریات حاصل کرنے کے لیئے چور بازار میں دینی پڑتی تھیں حکومت نے پیداوار بڑھانے کی بجائے صرف قیمتوں کے کنٹرول پر زور دیا۔ جس میں وہ بُری طرح ناکام ہوئی۔ کیوں کہ حکومت کی مشینری ایک نوکر شاہی کی مشینری تھی جس میں رشوت خوری زوروں پر تھی۔ اور حکومت رشوت خوروں پر زیادہ اعتبار کرتی تھی۔ اور جو عوام ان رشوت خوروں اور منافع خوروں کے خلاف احتجاج کرتے انہیں پکڑ کر جیل میں ٹھونس دیا جاتا۔ اس کا سیدھا

اثر غریب عوام پر ہوا۔ جنکی آمدنی میں ۵۰ فیصدی سے زیادہ اضافہ نہ ہوا۔ ان میں کئی قحط کا شکار ہوئے اور کئی بمشکل قحط کے منہ سے بچ کر صرف زندہ رہ سکے

آج ہندوستان کے سامنے سب سے اہم مسئلہ سٹرلنگ قرضہ کا ہے یعنی ڈالر سٹرلنگ ضمانتیں جن کے عوض ہندوستان نے برطانیہ کو نوٹ دیئے اور برطانیہ نے ان نوٹوں سے ہندوستان کی اچھی اچھی اور خاص خاص پیداوار اور صنعتی اشیاء خرید کر جنگ میں استعمال کیں۔ سوال یہ ہے کہ اس ۱۴۰۰ کروڑ روپیہ کے قرضہ کا کیا بنے گا۔ جو ہندوستان نے ادا کرنا ہے۔ حکومت برطانیہ کے چند معتبر ذرائع سے یہ اعلان کئے گئے کہ یہ قرضہ واپس نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ برطانیہ ہندوستان کے بچاؤ کی خاطر لڑتا رہا ہے اور اس جنگ میں ہندوستان نے اپنے بچاؤ میں برطانیہ کی نسبت کہیں کم خرچ کیا ہے۔ اس قسم کے لغو دعوے ہندوستان کی اس پونجی کے متعلق کئے جا رہے ہیں جس پہ ہندوستان اپنی صنعت و تجارت کی ترقی کے لئے نظریں جمائے بیٹھا ہے۔ یہ سٹرلنگ کی پونجی ہندوستانیوں کے منہ سے چھینے ہوئے نوالے ہیں۔ اُن کے جسم سے اتارا ہوا کپڑا ہے۔ یتیم بچوں کے باپ کا خون ہے ان کے منہ سے چھینا ہوا دودھ ہے جس سے گورے جسموں کی نشو و نما ہوتی رہی ہے ہندوستان میں ہر چیز کی قلت سے جو تکالیف دکھ اور عذاب ہندوستانیوں کو سہنے پڑے انہیں صرف ہندوستانی ہی جانتے ہیں ۵۰ لاکھ انسانوں کی موت ان برطانوی اقتصادی مدبروں کے لئے ایک سبق ہونا چاہیئے۔ مگر آج وہی آخری موں پہ بھی ہندوستان کے لاغر جسم کے چند آخری قطروں کو بھی چوس لینا چاہتے ہیں۔ آزاد ہندوستانی اس ناانصافی و ظلم کو کبھی معاف نہیں کرینگے۔ انگلستان کے سب سے بڑے سرمایہ دار اخبار اکونامسٹ نے اس قسم کے لغو اور شرارت آمیز دلائل دیئے ہیں کہ

جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگلستان کے سرمایہ دار اور ان کی حکومت
کس شرمناک گٹھ جوڑ میں محو ہے اس بات کی چھان بین کیلئے برطانوی پارلیمنٹ
کے چند ممبروں پر مشتمل ایک کمیٹی ہندوستان بھیجی گئی۔ جس نے اپنی رپورٹ
میں صاف طور پہ یہ بیان دیا کہ برطانوی حکومت نے جو اشیاء ہندوستان
میں خرید کیں۔ وہ سب کی سب کنٹرول نرخوں پر تھیں۔ اور ہندوستانیوں
کو اس سے کہیں زیادہ قیمتیں دینی پڑتی تھیں۔ اور یہ قرضہ بالکل جائز ہے اس سے
انگلستان کے سرمایہ داروں اور سامراجی ایجنٹوں کے منہ پہ ایک زبردست چپت
لگی۔ مگر وہ اس سے کب باز آتے تھے۔ وہ ہر طرح سے ہندوستان کے اس جائز
قرضہ کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ حالانکہ انگلستان کے سب سے بڑے
اقتصادی ماہر لارڈ گینز مرحوم نے یہ بات عیاں طور پر کہدی کہ یہ قرضہ عزت کیساتھ حاصل
کیا گیا ہے اور عزت کے ساتھ واپس ہونا چاہیئے۔ بہرحال انگلستان نے اس
مسئلہ کو ٹالنے کی کوشش کی اور ابھی تک اسے ٹالے جا رہا ہے۔

جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ ہندوستان نے جنگ میں اپنے
بچاؤ میں انگلستان سے کم حصہ ادا کیا ہے تو یہ ایک ایسا بہتانِ عظیم ہے کہ جس
پر جتنے رنج و غم کا اظہار کیا جائے درست ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان
کو نہ صرف جنگ میں دھکیلا گیا بلکہ جنگ کا اثر جتنا ہندوستان پر ہوا اس کے
ماسوا دنیا کا کوئی ملک اتنی تباہی کی آماجگاہ نہیں بنا۔ ہندوستان کے ہاتھ پاؤں
باندھ کر انہیں لڑنے کی تلقین کی گئی اور ان کا منہ اسطرح بند کر دیا گیا جیسا کہ ان
کی زبان کاٹ لی گئی ہو۔ ۲۰ لاکھ فوج اور بے شمار لوگوں کا جنگی کارخانوں میں کام کرنا
اور ہندوستان کی بے مثال بے کاری کا جنگ میں کام کی بہتات سے ختم ہو جانا
صاف بتاتا ہے کہ ہندوستان نے جنگ میں بہت اہم حصہ ادا کیا ہے یہ

یقینی امر ہے کہ اگر ہمارے سیاسی رہنماؤں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی تو ہندوستان اس سے کہیں زیادہ جنگ میں حصہ لیتا۔ مگر اس میں ہمیں وہ قربانیاں نہیں بھولنی چاہئیں جو جنگ کی وجہ سے بھوک اور افلاس اور بیماری کی شکل میں ہمیں دینا پڑیں اور ساتھ ہی برطانوی گولیوں کی بوچھاڑ بھی ہمیں نہیں بھول سکتی جو انہوں نے نہتے ہجوم پر ۱۹۴۲ میں کی۔ بہرحال یہ دلیل بالکل ناکارہ ہے کہ جنگ میں ہندوستان کے بچاؤ کی خاطر انگریزوں کا خون پسینہ ایک ہو رہا تھا ہاں یہ بات مانی جا سکتی ہے کہ ہندوستان کے اندر اور باہر انہوں نے برطانوی سامراج کی جڑوں کو خوب مضبوط کیا کیونکہ کبھی برطانیہ نے عوام کے ہاتھ میں طاقت منتقل کرنے کا ارادہ ظاہر نہ کیا۔

کبھی اس بات پر آنسو بہائے جاتے ہیں کہ برطانیہ اقتصادی طور پر جنگ میں تباہ ہو چکا ہے اس لئے ہندوستان اسے کچھ قرضہ معاف کر دے مگر اس بات کا جواب صرف یہ کہہ کر دیا جا سکتا ہے۔ کہ ہندوستان کی تباہ کن حالت برطانیہ سے کہیں بدتر ہے۔ نئے قحط کے آثار ہر جگہ نمودار ہو رہے ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان کی مفلسی اور تہیدستی کیا رنگ لائے گی۔

یہاں ہندوستانی سرمایہ داروں اور عوام کے نظریہ میں فرق کا اندازہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اور اب حکومتِ .... ہند چاہتی ہے کہ صرف برطانیہ کی مشینوں میں بنائے ہوئے مال کی ہندوستان میں کھپت کی جائے۔ یہ ایسا امر ہے جو ہندوستان کے لئے ہلاکت آمیز ثابت ہوگا۔ ہندوستانی سرمایہ دار چاہتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی طرح جنگ میں کمائے ہوئے منافع سے نئی مشینری حاصل کر سکیں خواہ اس میں آدھا حصہ برطانوی سرمایہ داروں کا ہی کیوں نہ ہو۔ مسٹر برلا اور انگلستان

کے اتحاد اور ٹاٹا اور انگلستان کی مشہور فرم امپیریل مکینیکل کمپنی کے علاوہ کئی ہندوستانی سرمایہ داروں کا برطانوی سرمایہ داروں سے گٹھ جوڑ اس بات کا کھلا ثبوت ہیں۔ عوامی نظریہ یہ ہے کہ ہم ہندوستان میں نئی صنعتیں چاہتے ہیں۔ مگر سب سے پہلے کروڑوں روپیہ کا برطانوی سرمایہ جو ہندوستان میں لوٹ کھسوٹ مچا رہا ہے اور لاکھوں کروڑوں روپیہ سود کی شکل میں انگلستان جا رہا ہے۔ اسے خرید لیا جائے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ آزاد ہندوستان کی حکومت نہ صرف خود باہر سے مشینری منگوا کر صنعت میں اضافہ کرے۔ بلکہ ہندوستانی سرمایہ داروں کے ہاتھ جتنی صنعتیں ہیں ان پر سختی سے کنٹرول کیا جائے یا اُن پر قبضہ کیا جائے۔

شروع میں ہم نے ایک نئے ڈاکو کا ذکر کیا تھا جس کا نام ڈالر ہے۔ یہ اب کافی مضبوط ہو چکا ہے۔ اس نے نہ صرف پرانے ڈاکو کا ایک بازو توڑ دیا ہے۔ بلکہ اس کے گھر پر بھی دھاوا بول دیا ہے۔ یعنی آج امریکہ برطانیہ کو اقتصادی ترقی میں بہت پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ جیسا کہ جنگ کے خاتمہ پر سیاسی مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک اتحادی نمائندہ اسمبلی بنائی گئی۔ اسی طرح دنیا کے اقتصادی اور مالی مسائل کو حل کرنے کے لئے بریٹن ووڈز کے مقام پر اتحادی قوموں کے نمائندوں کا جلسہ ہوا جس میں دنیا کے اقتصادی اور مالی اتحاد کے لئے مختلف تجویزیں پیش کی گئیں۔ بہر حال ایک ایسی سکیم تیار کی گئی جو سب کو منظور تھی وہ سکیم اس کتاب کے دائرۂ بحث سے باہر ہے اُسے تفصیل سے یہاں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس سکیم کی رو سے ایک بین الاقوامی فنڈ کھولا گیا۔ اور ساتھ ہی ایک بین الاقوامی بنک بھی۔ فنڈ کا یہ فرض ہوگا۔ کہ وہ اتحادی قوموں میں تجارت قائم کرے اکیدہ سرے سے جنگ کے بعد لئے ہوئے قرضے چکائے گا۔

امریکہ سب ملکوں کی جنگ میں بگڑی ہوئی حالت کو سدھار دیگا ۔ امریکہ کی اقتصادی
حالت مضبوط ہونے سے اس سکیم سے تقریباً امریکہ ہی فائدہ اٹھا سکتا
ہے ۔ مگر چونکہ وہ برطانیہ اور دوسرے ملکوں کی مدد حاصل کرنا ضروری سمجھتا ہے
اس لئے اس نے بہت دوڑ دھوپ کی اور برطانیہ کو اس سکیم کے ماننے کے عوض
میں ۴ ارب ڈالر قرضہ کے طور پر دیئے یعنی بوڑھا ڈاکو ہر طریقہ سے نئے
ڈاکو کے دام میں پھنس رہا ہے ۔ اس قرضے کی رو سے برطانیہ سوائے
ایک خاص رقم کے جنگ سے پہلے یا جنگ کے دوران میں اُس امریکن رقم
سے لئے ہوئے قرضہ کو نہیں چکا سکتا ۔ اور ان آرٹیکل کی رو سے وہ ان قرضوں
کا ایک حصہ بالکل ختم کر دینے پر مجبور کر دیا گیا ہے ہندوستان اور دوسرے
ممالک جنہوں نے برطانیہ سے قرضہ لیا ہے اس ظلم کا شکار ہوں گے ۔

دوسری جنگ عظیم سے کچھ عرصہ پہلے ایک امریکن ماہر نے جس کا نام لڈوول
ڈینی تھا مندرجہ ذیل الفاظ لکھے تھے ۔ "ہم (امریکہ) کی نو آبادیات میں شمار کیے
جاتے تھے ۔ لیکن اب پیشتر اس کے کہ وہ بالکل تباہ ہو جاتا ۔ ہماری نو آبادی
بن جائیگا ۔ مشینوں نے برطانیہ کو دنیا میں برتر پوزیشن دے دی تھی اب ہماری
مشینیں برطانیہ سے کہیں بہتر ہیں ۔ جن سے امریکہ زیادہ طاقت پکڑ رہا ہے امریکہ
کے مقابلہ میں برطانیہ یا دنیا کی برتری کی کیا امید ہو سکتی ہے" یہ الفاظ آج
درست ثابت ہو رہے ہیں ۔

برطانیہ امریکہ کا ۴ ارب ڈالر کا قرضہ ادا نہیں کر سکے گا ۔ اور امریکہ کو
اپنی اقتصادی مضبوطی کے لئے اس قرضہ کی واپسی کی ضرورت بھی نہیں
وہ صرف برطانیہ کے اقتصادی اڈوں کی طرف بھاگ دوڑ کرنا چاہتا
ہے ۔ تاکہ وہ اپنے ملک کے سرمایہ داروں کی سامراجی بھوک کو پورا کر سکے ۔ اسلئے

کبھی کبھی وہ اس بوڑھے ڈاکو سے اتحاد بھی کر لیتا ہے تاکہ وہ ان انقلابی طاقتوں کو جو اس فرسودہ نظام کو توڑنے پر تلی ہوئی ہیں تباہ و برباد کر سکے۔ یہ بوڑھا ڈاکو اب ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ کہ کسی طرح وہ اپنی کھوئی ہوئی طاقت کو برقرار رکھ سکے۔ ایک طرف اُسے انقلابی طاقتیں نیست و نابود کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ اور دوسری طرف نیا ڈاکو اسے تباہ کرنا چاہتا ہے۔ مگر چونکہ نئے ڈاکو کیساتھ اسکا انقلابی مظلوم .. جماعتوں کے خلاف متحدہ محاذ بن چکا ہے۔ اسلئے اس کی ہر ممکن کوشش یہ ہے کہ وہ اپنی نو آبادیات کے گلے پر پاؤں رکھ دے۔ نئے ڈاکو کو بھی اپنی طاقت پر بھروسہ ہے مگر وہ کبھی سچائی کی طاقتوں سے گھبراتا ہے اور کبھی ایٹم بم سے اور کبھی ہوائی جہازوں سے انہیں ڈرانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہندوستانی سرمایہ دار بھی ان میں سے کسی نہ کسی ڈاکو کا ساتھ دینے پر مجبور ہیں کیونکہ ان کے اپنے ملک میں عوام ان سے بدلہ لینے پر تلے ہوئے ہیں۔ مگر چونکہ بوڑھے ڈاکو کے خلاف ہندوستان میں سخت نفرت موجود ہے اس لئے وہ ڈاکو داؤ پیچ کھیل رہا ہے کہ کسی طرح وہ اپنا تسلط دوبارہ قائم کر سکے۔ مگر اس کے دن ختم ہوتے نظر آتے ہیں۔ اور ہندوستان و باقی تمام دنیا میں انقلابی طاقتیں اسے ختم کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔

اچھوت

اچھوت ہمارے سماج کا ایک ایسا عنصر ہیں جنہیں شاہراہ ترقی پر قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ ہندوستان کی تاریخ غلامی اور تشدد کی تاریخ ہے۔ آج کے اچھوت زمانۂ قدیم کے وہ آزاد ہندوستانی ہیں جنہیں آریہ حملہ آوروں نے مغلوب اور محکوم کیا۔ آبادی کا ایک حصہ تو حملہ آوروں کے خوف سے ملک کے جنوبی حصوں میں بھاگ کر چلے گئے۔ جو نہ بھاگ سکے، معمولی کاموں پر معمور کئے گئے۔ تقسیم محنت کی اس سیدھی شکل نے موروثی بن کر ایسی پیچیدہ شکل اختیار کر لی کہ وہ بنی نوع انسان کے لئے ایک آفت بن کر رہ گئی۔ غریبوں مجبوروں سے جو معمولی خدمت پر معمور تھے مجلسی بائیکاٹ برتا جانے لگا۔ نسلی برتری اور رنگ کا امتیاز اپنے جوہر دکھانے لگا۔ یہ ہے وہ سوغات جو آج کے "متمدن" سماج کو اپنے قدیم سماج سے ورثہ میں ملی ہے۔

اچھوت ہمارے سماج کا سب سے پسماندہ اور ستم رسیدہ طبقہ ہے ان میں چمار، مہتر، خاکروب اور ایسے معمولی پیشہ کار شامل ہیں۔ جن کی تعداد دو اور چار کروڑ کے درمیان بتائی جاتی ہے۔ اچھوت بذات خود کئی حصوں میں منقسم ہیں۔ اور ہر اونچے درجہ کا اچھوت اپنے سے نچلے درجہ کے اچھوت کو اسی طرح نجس اور ناپاک خیال کرتا ہے جس طرح اونچی ذات کے ہندو تمام اچھوتوں کو سمجھتے ہیں۔

اچھوتوں پر کئی قسم کے ظلم روا رکھے جاتے ہیں۔ مجلسی تشدد کے باعث اسے اچھوت کا نام دیا گیا ہے۔ ہندوؤں کے اعلےٰ طبقات اسے نجس سمجھتے ہیں

مندروں کے دروازے اس پر بند ہیں۔ اونچی جاتی کے کنوؤں سے انہیں
پانی پینے کی اجازت نہیں چند دیہاتی علاقوں میں سڑکیں تک جدا ہیں۔ مدرسوں
میں داخلہ بند ہے اور یہ لوگ اپنی علیحدہ بستیوں میں رہتے ہیں۔ جاتی کی
یہ اونچ۔ نیچ باطن کی پاکیزگی پر منحصر نہیں۔ کہ اعلےٰ وہ ہے جس کا باطن
صاف ہے اور ادنیٰ وہ جس کا باطن کثیف ہے یہ مجلسی ناروا داری بودی قسمت
کی ان روایات پر قایم ہے۔ جن کا ہمارا سماج حامل ہے۔ یورپ میں کتوں
سے بھی اس سے بہتر سلوک کیا جاتا ہے۔

ہندو سماج کا ایک پر اثر حصہ اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانے
کو اُٹھ کھڑا ہوا ہے مہاتما گاندھی اس تحریک کے رہنما ہیں۔ آپ ایک جاتی کی
دوسری جاتی پر فوقیت کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اور اچھوت کو ذلت کی انتہائی
گہرائی سے اعلےٰ ذات کے ہندوؤں کے برابر کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر آپ کو اس
مشن میں پوری کامیابی حاصل نہیں ہوئی کیونکہ صدیوں کے جذبات کو جو ذہن
میں گھر کر چکے ہیں اتنی جلدی مٹا دینا آسان کام نہیں۔ بایں ہمہ یہ ایک حقیقت
ہے کہ آپ نے نفرت کے جذبہ کو کافی حد تک نرم کر دیا ہے اور آج اعلےٰ جاتی
کے ہندو عملی طور پر نہ سہی نظری طور پر ضرور اس ظلم کو ختم کر دینے کے حق میں
نظر آتے ہیں۔

اچھوت کی مشکلات مجلسی ناروا داری کے مٹ جانے سے ختم نہیں ہو سکتیں
کیوں کہ اقتصادی طور پر وہ سب سے پسماندہ طبقہ ہے۔ اور اس سیڑھی کے
سب سے نچلے زینہ پر کھڑا ہے۔ اس لحاظ سے اُسے اُن مزدوروں سے جدا کرنا مشکل ہے۔
جنہیں بھوک۔ افلاس اور بیکاری غیر منصف سماجی نظام سے تحفہ کے طور پر
ملتے ہیں۔ اچھوت اقتصادی لحاظ سے اس جماعت کا رکن ہے جسے سب سے

زیادہ لوٹ کا شکار بنایا جاتا ہے ان میں سے اکثر زرعی مزدور ہیں یا چمڑا
کے کارخانوں اور چائے کے کھیتوں میں کام کرنے والے ادنےٰ مزدور
وہ مزدور طبقہ کے لازمی جز ہیں اور اس لحاظ سے غریب اور بے نوا پرجا
کا اہم ترین حصہ ہیں۔ وہ پرجا جس کی قسمت کا فیصلہ قومی حکومت
کی بجائے انکی اپنی تنظیم پر منحصر ہے۔

ٹراونکور، حیدرآباد وغیرہ کے معرض وجود میں آنے کا ذکر کیا جا چکا ہے
وسط ہندوستان کی راجپوت ریاستوں سے متعلق عرض ہے کہ وہ ایک عرصہ
مغلوں سے برسرِ پیکار رہیں۔ پھر مرہٹوں سے طاقت آزمائی کرتی رہیں مگر
انگریزوں نے تدبر سے کام لے کر انہیں مٹ جانے سے بچا لیا۔ اور اُن کی
ہستی تسلیم کر لی۔ راجپوت خاندان بدستور اپنے اپنے علاقوں پر حکمران رہے
اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی قلمروؤں میں مرہٹے اقتدار کے دوران حیات
میں مہم جو فوجی سپاہیوں نے انہیں جنم دیا تھا۔ انگریزوں نے مرہٹہ
طاقتوں کے تار پود بکھیرنے شروع کئے اور ان قلمروؤں نے شرائط
طے کر کے اپنی ہستی تسلیم کرالی۔

ریاستیں

برطانوی ہندوستان کا رقبہ ۱۰۰۶۱۶۱ مربع میل ریاستیں ۷۱۲۵۰۰ میل رقبہ کو گھیرے ہوئے ہیں۔ برطانوی ہندوستان میں ۲۷۱۵۲۶۹۳۳ لوگ آباد ہیں ریاستوں کی آبادی ۸۱۳۱۰۸۴۵ افراد پر مشتمل ہے ریاستیں آبادی اور رقبہ میں ایک نہیں۔ ایک طرف ریاست حیدرآباد ہے جس کی آبادی ۱۴۳۳۲۰۳۰ اور رقبہ ۸۰۰۰۰ مربع میل ہے۔ دوسری طرف ریاست بلباری ہے جس کی آبادی ۲۷ افراد اور سالانہ آمدنی ۸۰ روپے ہے اور ریاست ناردوطی جس کا رقبہ ایک مربع میل ہے اور آبادی ۲۷ افراد سالانہ آمدنی ۳۰۰ روپیہ ہے مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ۲۰۲ ریاستیں ایسی ہیں جن کا رقبہ فی ریاست ۱۰ مربع میل سے کم ہے۔ ۱۳۹ کا ۵ مربع میل ہے، ایسی ہیں جن کا رقبہ ایک مربع میل سے زیادہ نہیں۔

ریاستیں عجیب و غریب گوناں گونی کی مظہر ہیں برطانوی ہندوستان کی طرح وہ کسی ایک مرکز یا اختیار کے ماتحت نہیں ہر ایک ریاست کے حالات دوسری ریاست سے مختلف ہیں۔ حکمران طبیعتوں۔ کیریکٹر۔ عادات اور اوصاف میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ٹراونکور اور میسور نظام حکومت میں بہت ترقی یافتہ ہیں اور اکثریت اس لحاظ سے ابھی قرونِ وسطےٰ کی یادگار ہے۔ ریاست حیدرآباد کو لیجئے۔ آبادی کی بھاری اکثریت ہندو ہے حکمران مسلمان ہے اس کے بالمقابل ریاست جموں و کشمیر جس کی آبادی ۹۵ فیصدی مسلمان ہے لیکن مہاراجہ ہندو ہے۔

ٹلر کمیٹی نے ریاستوں کی تقسیم تین حصوں میں کی ہے ۱۰۹ ریاستیں
براہ راست "مجلس مہاراجگان" کی ممبر ہیں اور انہیں علیحدہ علیحدہ نمائندگی حاصل
ہے۔ ۱۲۶ ریاستیں ایسی ہیں جن کی نمائندگی ۱۲ نمائندے کرتے ہیں۔
۳۲۷ جاگیریں وغیرہ ہیں۔ جنہیں مجلس مہاراجگان میں نمائندگی حاصل
نہیں۔ صرف ۴۰ ریاستیں ایسی ہیں جن سے باقاعدہ اور باضابطہ طور پر
عہد نامے عمل میں لائے گئے ہیں۔ باقی کا وجود اور سالمیت برقرار رکھنے
کے وعدے کئے گئے ہیں۔

اول درجہ کی ریاستیں داخلی نظم و نسق میں مختارِ مطلق نہیں۔ انہیں
حکمرانی کے تمام اختیارات حاصل ہیں۔ البتہ بیرونی تعلقات میں آزاد نہیں
اس زمرہ میں حسب ذیل ریاستیں شامل ہیں۔ حیدرآباد۔ گوالیار۔ اندور
بھوپال۔ پھلکیاں۔ پٹیالہ۔ جیند۔ نابھہ اور جے پور۔ بیکانیر۔ وغیرہ۔ دوسرے
درجہ کی ریاستیں۔ اپنے نظم و نسق میں برطانوی حکومت کے مشورہ اور صلاح کی
محتاج ہیں۔ اس زمرہ میں گیکواڑ آف بڑودا۔ کولہاپور۔ کوچین اور میسور
وغیرہ شامل ہیں۔ تیسرے درجہ کی ریاستیں برطانوی نمایندگان سے صلاح کی ہی
مجبور نہیں۔ بلکہ داخلی نظم و نسق میں محدود اختیارات کی مالک ہیں مثلاً۔ فوجداری
مقدمات میں سزائے موت سنائی جائے۔ تو فیصلہ کی خبر اسی وقت ریاست
کے ایجنٹ کو کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح دیگر امورات میں گاہے گاہے۔ ریاست
کے انتظامی معاملات پر رپورٹیں ایجنٹ کو پیش کرنیکا دستور رہے۔ اس
زمرہ میں شملہ کی چند پہاڑی ریاستیں شامل ہیں۔ کاٹھیاواڑ کی ریاستیں
اور بندھیل کھنڈ کی ریاستیں وغیرہ چوتھے درجہ کی ریاستوں میں کوئی کام
ایجنٹ یا ایجنٹ کی صلاح کے بغیر نہیں طے پا سکتا۔ حکمران برائے نام ہی حکمران

رام تہا یجنٹ یا ایجنٹ کے ماتحت ہیں - اسں زمرہ میں اڑیسہ کی ریاستیں
بہار اور اڑیسہ کی باجگذار ریاستیں اور دیگر چھوٹی چھوٹی ریاستیں شامل ہیں

پولیٹیکل ایجنٹ

اول اول تو ریزیڈنٹ یا پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی ریزیڈنٹ کی حیثیت تھی۔ مگر ۱۷۸۹ء کے بعد ریزیڈنٹوں کو تجارتی معاملات میں دلچسپی لینے کی ممانعت کر دی گئی۔ یوں تو ریزیڈنٹ برطانوی حکومت کے سفیر کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن اُن کی دلچسپیوں کا یہ عالم تھا۔ کہ حکمران کی اصطبل اور روزیہ کے لنگر خانہ تک توجہ کا مرکز بننے سے محفوظ نہ تھے۔ غدر کے بعد صورتِ حالات بالکل بدل گئی۔ ریزیڈنٹ کا اجنبی طاقت کے ڈپلومیٹک ایجنٹ نہ رہے۔ بلکہ ایک برتر و فوق طاقت کے انتظامی اور نگران کار افسر بن گئے۔ اور آج یہ حالت ہے۔ کہ مہاراجے پولیٹیکل ایجنٹوں کے حضور میں شرف باریابی حاصل کرنے جاتے ہیں۔

پولیٹیکل ایجنٹ یا ریزیڈنٹ ریاست میں وائسرائے کے ذریعہ تاجِ برطانیہ کا نمائندہ ہے۔ ریاست کے متعلق تمام اطلاعات اسکی معرفت اقتدار اعلےٰ تک پہنچتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پولیٹیکل محکمہ کی سرگوشیاں ریاستی حکام کے لئے گرج بن جاتی ہیں۔ مہاراجہ صاحب خوف کھاتے ہیں وزراء خوشامد کرتے ہیں اور تمام افسران ریزیڈنٹ کے اشاروں پر تگنی کا ناچ ناچتے ہیں۔ بٹلر کمیٹی کے سامنے چانسلر مجلس مہاراجگان نے فریاد کی کہ "ریاست کے انتظامات تو گویا پولیٹیکل افسر کے ماتحت کر دیئے گئے ہیں" ریاستی حکام بڑی بے تکلفی سے سرکار برطانیہ کے اس حق کو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ انتہائی بدانتظامی کا مظاہرہ ہو یا انصاف کا دامن ہاتھ سے

چھوٹ جائے تو سرکار مداخلت سے معاملہ سلجھا دے۔ مگر ہماری رائے میں اس حق کا یہ مطلب نہیں کہ پولیٹیکل ایجنٹ ریاست کے معاملہ میں ٹانگ اڑاتے رہیں۔

حکمران ریاست سے باہر ہو تو پولیٹیکل ایجنٹ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ایجنٹ کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکمران کی دلچسپی ریاستی امور میں کم ہو جاتی ہے۔ دو رخی کا نتیجہ رعایا کے حق میں مفید نہیں نکلتا۔ ریاست کے انتظامات کی ذمہ داری ریزیڈنٹ پر نہیں ہوتی حکمران اپنی مرضی برتنے میں ہچکچاتے ہیں۔ رعایا لیت و لعل کا شکار ہو کر تباہ ہو جاتی ہے۔

حکمران

۵۶۲ ریاستوں کا مسئلہ ۸۱۳۱۰۸۴۵ انسانوں کا مسئلہ نہیں یہ ۵۶۲ چھوٹے بڑے حکمرانوں کا مسئلہ ہے۔ حکمران ہر لحاظ سے خودمختار اور مطلق العنان ہیں۔ وہ لوگوں کی مرضی سے حکومت نہیں کرتے اور ان کے درباروں کی جاہ و حشمت ... عوام کے ترجمانوں کی خاموش رضامندی کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ وہ لوگوں کی مرضی کے بغیر حکومت کرتے ہیں جس طرح چاہتے ہیں ٹیکس لگاتے ہیں۔ جو دل میں آتا ہے قانون نافذ کر دیتے ہیں خزانہ پر ہاتھ صاف کرتے ہیں اور مطلق العنانی کے نتائج سے بری ہیں ان کا درجہ تباہی سے محفوظ ہے۔

ہندوستان کے ماسوا موروثی مطلق العنانی صفحہ ہستی سے معدوم ہو چکی ہے۔ بادشاہ لوگوں کی مقرر کردہ مخصوص رقم صرف کرتے ہیں شہنشاہ انگلستان کل قدرتی آمدنی کے ۱۶۰۰ میں سے ایک حاصل کرتے ہیں۔ بادشاہ بلجیئم ۱۰۰۰ میں سے ایک۔ شہنشاہ اٹلی ۵۰۰ میں سے ایک۔ شاہ ناروے ۷۰۰ میں سے ایک۔ کوئی بھی ٹراونکور کی مہارانی کی طرح ۱۷ میں سے ایک حاصل نہیں کرتا۔ یا مہاراجہ میسور کی طرح ۱۴ میں سے ایک یا نظام حیدرآباد اور مہاراجہ بڑودہ کی طرح ۱۳ میں سے ایک مہاراجہ جموں اور کشمیر اور مہاراجہ بیکانیر کی طرح ۱۲ میں سے ایک۔

مہاراجہ میسور کے ذاتی مصرفات ۱،۸۰،۰۰۰ پونڈ (۲۳،۸۰،۰۰۰ روپیہ) سالانہ ہیں اور ٹراونکور کے راج محل کے اخراجات ۱،۰۰،۰۰۰ پونڈ۔ یعنی

۱۱۰,۰۰۰ روپیہ سالانہ ہیں شہنشاہ اطالیہ کو حکومت کی طرف سے ہر سال ۱۱۲۵۰۰ پونڈ ملتے ہیں شہنشاہ اٹلی کی تنخواہ ۱۰۰۰۰ ۲ ملین پونڈ سالانہ آمدنی سے ہی ادا کی جاتی ہے۔ مہارانی طراونکور تقریباً شہنشاہ اطالیہ کے مساوی رقم حاصل کرتی ہے۔ مگر ریاست کی سالانہ آمدنی ۴½ ملین پونڈ ہے۔ مہاراجہ میسور شہنشاہِ امانیول سے نصف صرف کرتا ہے۔ مگر ریاست کی آمدنی اطالیہ کے مقابلہ میں سترہ (۱۷) گنا کم ہے۔

ہز مجسٹی حضور شہنشاہِ سلامت ۴۷۰,۰۰۰ پونڈ سالانہ حاصل کرتے ہیں اور شہنشاہِ جاپان ۴۵۰,۰۰۰ پونڈ لیتے ہیں اور نظام حیدرآباد ریاست کے خزانہ سے پچاس لاکھ روپیہ سالانہ وصول کرتے ہیں جو دو شہنشاہوں کی سالانہ آمدنی کے تقریباً مساوی ہے۔ اگر اسمیں جو بانے ضبطگیاں اور ذاتی جاگیریں شامل کر لی جائیں (جاپان اور برطانیہ کے شہنشاہ ایک مقررہ سالانہ آمدنی کے حق میں ذاتی جاگیروں سے دستبردار ہو گئے ہیں) تو نظام کی سالانہ آمدنی دو شہنشاہوں کی مجموعی آمدنی کے برابر پہنچ جاتی ہے ریاست حیدرآباد کی سالانہ آمدنی ساڑھے چھ کروڑ روپیہ یا ۵ ملین سٹرلنگ کے لگ بھگ ہے۔ جاپان اور انگلستان کی علیحدہ علیحدہ آمدنی ۸ سو ملین سٹرلنگ ہے یا یوں کہیئے کہ ہز اگزالٹڈ ہائی نس حضور نظام کی سالانہ آمدنی ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل سے کئی گنا زیادہ ہے اگر حضور نظام کی ایک سال کی آمدنی ۹ فی صدی شرح سود میں جمع کر دی جائے تو اُس سے وائسرائے اور اسکی اگزیکٹو کونسل کے چھ ممبران کی تنخواہیں ہمیشہ ادا کی جا سکتی ہیں۔

۵۶۲ ریاستوں میں ۵۶ ریاستیں ایسی ہیں جنہوں نے اپنے حکمرانوں

کی تنخواہیں مقرر کر رکھی ہیں باقی ریاستوں میں ریاست کا خزانہ والئی ریاست کی ذاتی ملکیت تصور کیا جاتا ہے۔ ان ۵۶ ریاستوں کی حالت یہ ہے کہ سالانہ رپورٹ بڑے غور و فکر کے بعد مرتب کی جاتی ہے۔ اکثر حالتوں میں عوام انہیں حاصل نہیں کر سکتے۔ رپورٹیں مرتب کرنے میں یہ کمال دکھایا جاتا ہے کہ اخراجات کی بہت سی شقیں جو در اصل راج محل کے مصارف میں درج ہونی تھیں۔ پبلک کے کاموں میں درج کر دی جاتی ہیں مثلاً مہاراجہ صاحب بیکانیر کے محل کی مرمت وغیرہ کے تمام اخراجات سول ورکس کی مد میں شامل کر دیئے گئے۔ تمام ریاستوں میں عام طور پر بہت سے اخراجات ناگہانی ضروریات یا متفرق ضروریات میں شامل کر کے مہاراجہ صاحب کا بوجھ ہلکا کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً جام نگر کی ۲۷-۱۹۲۶ء کی رپورٹ کے مطابق ریاست کے کل مصارف ۴۰۰,۰۰۰ پونڈ ہیں جن میں ۲۰۰,۰۰۰ پونڈ ناگہانی ضروریات میں شمار کر لئے گئے

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنی بھاری رقوم کیا ل کر صرف ہوتی ہیں۔ رعایا کے خون پسینہ کی کمائی پر شکوہ محلات کی تعمیر پہ صرف ہوتی ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ کی موٹر کاریں خریدی جاتی ہیں۔ اور پھر ایک مرتبہ سواری کرنے کے بعد فروخت کر دی جاتی ہیں۔ لاکھوں روپے یورپ میں عیش و عشرت اور سیر و تفریح پر خرچ کیے جاتے ہیں۔ ہر رنگ نقش و نگار اور وضع قطع کی عورتیں دوشیزائیں حاصل کی جاتی ہیں۔ اور انہیں حاصل کرنے پر کوئی رقم کا فی خیال نہیں کیجاتی۔ کے۔ ایل گابا اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "ہز ہائی نس" میں رقم طراز ہیں

ایک مہاراجہ صاحب اپنی موٹر کاروں پہ اپنی رعایا کی تعلیم سے چار گنا زیادہ صرف کرتے ہیں۔ ایک اور مہاراجہ صاحب ایسے ہیں جن کی ریاست

میں عقد نابالغاں ممنوع ہے۔ چند ایسے ہیں۔ جو اپنی ۷ سالہ لڑکیوں
کو اپنی خواہشات نفسانی کا شکار بنانے سے گریز نہیں کرتے۔ ایک اور
ایسے ہیں جن کی بیویوں کا شمار نہیں۔ ایک حکمران اپنے والدِ محترم
کی اہلیہ محترمہ کے حسن و عشق کی بہار لوٹتے ہیں۔ ایک اور ایسے ہیں
جنہوں نے اپنی تین سو سوتیلی مائیں ۳۰۰ روپیہ فی کے حساب
سے فروخت کر دیں۔ ایک مہاراجہ کی خوشنودی اور رونق دل کا
سامان دو فلم ایکٹرلیس ہیں۔ بہت سے حکمران اپنی نفسانی خواہشات
کی تکمیل کے لئے اسقاط حمل کی نسبت کوئی موزوں ذریعہ نہیں سمجھتے
کچھ ایسے ہیں جنہوں نے شادی اور ماتم پر ٹیکس لگا رکھے ہیں۔
کئی ایسے ہیں جو دوشیزاؤں کے حُسن و عشق کی بہار لوٹتے ہیں
ایک اور حکمران ایسے ہیں جو لقمہ کے بغیر درخواست خود نہیں
کرتے۔ کچھ عورتوں پر خوبصورت نوجوانوں کو ترجیح دیتے ہیں
چند نفسانی اور اخلاقی گمراہیوں کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں بہت
کم ایسے ہوں گے۔ جو کسی قسم کے امتحانات اور تجربات میں سے
گزرتے ہوں۔ اگرچہ ان کی زندگی کے ساتھ لکھوکھا نوع انسانی
کی قسمتوں کا سوال وابستہ ہے۔ لیکن مشکل سے چند ایسے ہوں
گے جو فخر سے اپنی خوبیوں پر سر بلند کر سکتے ہیں یا ایسے کیریکٹر کے
مالک ہیں جو انسان کو بادشاہت کے فرائض منصبی سنبھالنے
کے قابل بناتا ہے۔

ایک آدھ ریاست کو چھوڑ کر حکمران اپنے آپ کو رئیس کلیہ ہی تصور نہیں کرتے
بلکہ اپنی ذات با صفات کو نظمِ ریاست خیال کرتے ہیں۔ حکمران کا آرام

ریاست کا آرام ہے حکمران کا حق ریاست کا حق ہے۔ المختصر وہ بذات خود ریاست ہے۔ ریاستی مزاجیہ رائے عامہ سے بہتر اور بلند ہوتا ہے۔ بادشاہ غلطی و خطا سے بالاتر ہوتا ہے۔ اگر بادشاہ غلطی اور خطا سے بالاتر ہے اور عنانِ حکومت اس کے ہاتھ میں ہے تو انتظامی مشینری لازماً بےخطا ہوگی۔ جو بے خطا ہے۔ اور جس سے خطا سرزد نہیں ہو سکتی۔ یقیناً لاریب ہے۔ اس لئے اس کی حکومت بازپرسی سے بلند ہے۔ اس تھیوری پر ہندوستان کی سینکڑوں ریاستوں کا نظام حکومت قائم ہے اگر کوئی ان مسلمہ قانونی اصولوں کے خلاف دماغ میں خیال تک بھی لاتا ہے تو وہ ایک خوفناک جرم کا ارتکاب کرتا ہے کیوں کہ اس کا ایسا کرنا بادشاہ (نائب خدا یعنی خدا کے سایہ) کے خلاف بغاوت کا دماغ میں خیال لانا ہوتا ہے

آئینی حیثیت

بٹلر کمیٹی کی رپورٹ پڑھنے سے پتہ چلتا ہے۔ کہ ۵۶۲ ریاستوں میں سے ۵۳۴ میں کسی قسم کی لیجسلیٹو اسمبلی موجود نہیں۔ ۵۲۰ ریاستیں ہائی کورٹ یا کسی قسم کی عدالتہائے بالا سے محروم ہیں۔ ۵۳۰ میں ایگزیکٹو اور عدالتی فرائض ایک ہی انسان کے سپرد ہیں۔ ۵۰۰ میں والئی ریاست کے مصرفات مقرر نہیں۔ ۵ میں ملازمتوں کا کوئی اصول مقرر نہیں مجمل طور پہ یہ کہنا چاہیے۔ کہ ۵۶۲ ریاستوں میں سے ۵۰۰ ریاستیں ایسی ہیں جنہوں نے بٹلر کمیٹی کی تجویز کردہ اصلاحات نافذ نہیں کیں اور جہاں اصلاحات نافذ ہوئی ہیں صورت حالات بدستور وہی ہے۔ خود بٹلر کمیٹی کی رپورٹ رقمطراز ہے۔ کہ اصلاحات ابھی ابتدائی مراحل پہ ہیں اور لیجسلیٹو کونسلوں کی نوعیت محض مشاورتی ہے۔

میسور ٹراونکور اور کوچین کی استثنا کے بغیر ہندوستان میں کوئی ریاست ایسی نہیں جس میں لوگوں کے نمائندوں کو پُراثر آواز حاصل ہو۔ قانون حکمران کی طرف سے یا آپ کی ہدایت کے مطابق احکام، فرمان اور فتوے جاری کیے جاتے ہیں۔ ان کی بنیاد حکمران کی ترنگ سے زیادہ گہری نہیں ہوتی چند ریاستوں میں برطانوی قوانین اور ضوابط والئی ریاست کی مرضی کے مطابق تھوڑی بہت ترمیم کے بعد اپنا لیے گئے ہیں۔ مگر یہ نام نہاد قانون والئی ریاست پر حاوی نہیں۔ وہ انہیں منسوخ کر سکتا ہے۔ ترمیم اور معطل کر سکتا ہے۔ کسی انسان کو آزادی سے محروم کر سکتا ہے۔ ہر کسی کی

جائیداد ضبط کرسکتا ہے۔ عدالتوں میں چل رہے مقدمات واپس لے سکتا ہے۔ اور کسی ضابطہ اور قانون کی پرواہ کئے بغیر احکامات جاری کرسکتا ہے۔ رعایا کو حضور ہز ہائی نس اور آپ کے احباب کے خلاف کسی عہدنامہ کی تنسیخ یا ان کے حقوق پر چھاپہ مارنے کی بنا پر مرافعہ گزارنے ...... یا عرضی دینے کا حق نہیں اگر کوئی ادنےٰ سے ادنیٰ افسر اپنی ذاتی حیثیت میں کسی فوجداری جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اور خواہ اُس جرم کا کسی صورت [illegible] کی ڈیوٹی سے کوئی تعلق نہ ہو حکمران کی منظوری کے بغیر اس پر مقدمہ نہیں چلایا جاسکتا اگرچہ پبلک جلسوں۔ اخبارات۔ اور جماعت بندی پر کوئی خاص تعزیر نہیں لیکن اسکے باوجود کوئی پبلک جلسہ خواہ اس کی نوعیت مجلسی ہو منعقد کرنے کی اجازت نہیں۔ کوئی اخبار شائع نہیں ہوسکتا اور نہ کوئی جماعت حکمران کی اجازت کے بغیر بنائی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی جلسہ منعقد ہو اخبار شائع کیا جائے یا جماعت قائم کی جائے۔ پولیس ہر وقت مداخلت سے کام تمام کرسکتی ہے۔ جس کا کوئی علاج نہیں۔

میسور۔ میسور میں ۱۸۸۱ء میں اسمبلی قائم ہوئی۔ ۱۹۰۷ء میں ریاست نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اور ایک لیجسلیٹو کونسل قائم کی گئی ۱۹۳۹ء میں مہاراجہ صاحب نے نئی اصلاحات کا اعلان کیا جس کی رو سے اسمبلی کے ممبران کی تعداد ۳۱۰ قرار دی گئی۔ اور اسمبلی کی میعاد چار مقرر ہوئی۔ اسمبلی کے اختیارات بلوں پر مشورہ اور صلاح دینے تک محدود ہیں۔ بل کی منظوری کے لئے اسمبلی کے لئے دو تہائی ممبران کی حمایت ضروری ہے۔ پھر اسے لیجسلیٹو کونسل میں پیش کیا جائے گا۔ یہ حکومت پر موقوف ہے کہ کونسل میں بل اسمبلی کی تجویز کردہ ترامیم کے ساتھ پیش کرے یا اپنی اصلی حالت میں

کونسل کے ممبران کی تعداد ۶۸ ہے جن میں ۴۴ منتخب ہوں گے۔ کونسل بل پاس کر دے۔ تو اسے دوبارہ اسمبلی کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ حضور مہاراجہ صاحب سے اجازت لے کر پاس کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ مہاراجہ صاحب کے تحفظات ہیں۔

دو وزیر انتخاب سے مقرر کئے جائیں گے۔ ایگزیکٹو کونسل دیوان اور چار وزراء پر مشتمل ہو گی۔ جن میں دو وزیر لوگوں کے نمائندے ہوں گے جنہیں دوسرے وزیروں کے برابر کے حقوق حاصل ہوں گے۔

ٹراونکور :- میسور کی طرح ٹراونکور میں بھی دو مجالس آئین ساز ہیں۔ اولاً سٹیٹ کونسل جس کے ممبران کی تعداد ۳۷ ہے جن میں سے ۱۵ نامزد ہوتے ہیں۔ ان پندرہ میں دس آفیشل ہوتے ہیں۔ دیوان صاحب صدر ہیں۔ ثانیاً۔ اسمبلی ہے جس کے ممبران کی تعداد ۷۲ ہے۔ ۶۲ غیر آفیشل ہیں اور ۱۰ آفیشل۔ غیر آفیشل میں ۱۴ نامزد ہیں دیوان صدر ہے۔ لیکن اسمبلی کا منتخبہ نائب صدر دیوان کی غیر حاضری میں صدارت کرنے کا مجاز ہے

دونوں دیوانوں کو قوانین اور آئین و ضوابط پیش کرنے اور پاس کرنے کا حق حاصل ہے بجٹ پر بحث ہوتی ہے سوالات کئے جاسکتے ہیں اور ریزولیشن پاس ہو سکتے ہیں۔ مالیات پر اسمبلی کو کونسل کی نسبت زیادہ اختیارات حاصل ہیں۔

کوچین :- کی اسمبلی ۵۸ ممبران پر مشتمل ہے جن میں سے ۳۸ منتخب ہوتے ہیں ۱۲ آفیشل ہیں۔ ۸ اقلیتوں کے نمائندگان کے طور پر منتخب کئے جاتے ہیں ایک وزیر بھی مہاراجہ کے مندرجہ ذیل تحفظات کے بغیر اسمبلی کو وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ ان امور پر اسمبلی بحث کرنے کی مجاز نہیں۔

اسکے حکمران خاندان (۲) حکمران کے تاج اور دوسری ریاستوں سے تعلقات (۳) تاج سے معاہدہ جات سے متعلقہ امور (۴) ریاست کی فوجی طاقت۔ (۵) ہائی کورٹ کے ججوں کا رویہ ڈیوٹی پر۔ (۶) ہز ہائی نس کے کنٹرول میں ہندوؤں سے متعلقہ امور (۷) مجرموں کی جلاوطنیاں اور سزائیں۔

کشمیر و جموں: پرجا سبھا ۷۵ ممبران پر مشتمل ہے۔ جن میں ۵۹ تین سال تک ممبر رہتے ہیں۔ ۱۶ اسٹیٹ کونسل کے نمائندے ہیں جنہیں مہاراجہ صاحب ۱/۲ ۴ سال کیلئے مقرر کرتے ہیں پرجا سبھا میں غیر آفیشلوں کی اکثریت ہے ۳۳ منتخب کئے جاتے ہیں۔ ۱۹۳۹ء کے ایک شاہی اعلان کے ذریعے نشستیں اور بڑھائی گئی ہیں۔ اس طرح ۴۰ نشستیں منتخب اور ۳۰ نامزد کی گئیں ہیں پرجا سبھا کے نائب صدر منتخب ہوتے ہیں۔ زیادہ تر اختیارات مجلس وزرا کے ہاتھ میں ہیں حسب ذیل مہاراجہ صاحب کے تحفظات ہیں۔ پرجا سبھا ان پر بحث کی مجاز نہیں۔ (۱) حکمران اسکے خاندان اور اس کے گھریلو معاملات (۲) ریاست اور اقتدار اعلےٰ کے درمیان تعلقات ریاست اور دیگر طاقتوں یا ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ تعلقات (۳) گلگت اور لداخ کی سرحدات سے متعلقہ امور (۴) جاگیرداری حقوق جن کے تحفظ کا یقین سرکار ہند نے معاہدہ جات کے ذریعہ دلایا ہے (۵) فوج کی تنظیم ڈسپلن اور کنٹرول (۶) محلات استقبالوں شکاروں۔ شاہی اصطبلوں محل کے محافظ دستے۔ شاہی موٹر خانہ دیگر رسومات اور حیثیتوں سے متعلقہ محکمہ جات۔

حیدرآباد ۱۹۳۷ء کی اصلاحات کے مطابق ۸۵ ممبروں پر مشتمل ایک ایوانی لیجسلیٹو اسمبلی عمل میں لائی گئی ہے۔ جن میں ۴۲ منتخب ہوں گے۔ ۱۴ آفیشل اور ۲۸ نامزد مجلس آئین ساز کے اختیارات چار۔

حصوں میں تقسیم کر دیئے گئے ہیں۔ قومی ترقی کے محکمہ جات سے متعلقہ امور میں حضورِ نظام کی اجازت کے بغیر قانون پاس ہو سکیں گے۔ دوسری شق میں فوجداری قوانین اور مزدوروں کی بہتری کے مسائل ہیں۔ اس کے متعلق کوئی قانون پیش کرنے سے پہلے حکمران کی اجازت لینی پڑے گی۔ اسی مد میں لوکل سیلف گورنمنٹ، محکمہ زراعت اور جنگلات شامل ہیں۔ تیسری اور چوتھی شق میں بیرونی ملک نوکریاں۔ عثمانیہ یونیورسٹی برآمد و درآمد۔ پوسٹ اور ٹیلیگراف۔ ہوائی جہاز اور مقامی ٹیکسوں کے علاوہ ٹیکس شامل ہیں۔ یہ ہز اگزالٹڈ ہائی نس کے محفوظ موضوعات ہیں۔ مسلمان اگرچہ اقلیت میں ہیں۔ مگر انہیں برابر کی نمائندگی دی گئی ہے۔ حکمران ریاست کے رئیس کلیہ اور عوام الناس کی بادشاہت کے پیکر قرار دیئے گئے ہیں

دھوں میں تقسیم کردیئے گئے ہیں۔ قومی ترقی کے محکمہ جات سے متعلقہ
امور میں حضورِ نظام کی اجازت کے بغیر قانون پاس ہو سکیں گے۔ دوسری شق
میں فوجداری قوانین اور مزدوروں کی بہتری کے مسائل ہیں۔ اس کے متعلق
کوئی قانون پیش کرنے سے پہلے حکمران کی اجازت لینی پڑے گی۔ اسی مد میں
لوکل سیلف گورنمنٹ، محکمہ زراعت اور جنگلات شامل ہیں۔
تیسری اور چوتھی شق میں پبلک نوکریاں، عثمانیہ یونیورسٹی، برآمد و درآمد۔
پوسٹ اور ٹیلیگراف۔ ہوائی جہاز اور مقامی ٹیکسوں کے علاوہ ٹیکس
شامل ہیں۔ یہ ہز اگزالٹڈ ہائی نس کے محفوظ موضوعات ہیں۔ مسلمان اگرچہ اقلیت
میں ہیں۔ مگر انہیں برابر کی نمائندگی دی گئی ہے۔ حکمران ریاست کے رئیس
کلیہ اور عوام الناس کی بادشاہت کے پیکر قرار دیئے گئے ہیں

~~~
~~~

بدنصیب رعایا اور انکے حکام

ہم پچھلے ابواب میں ہندوستان کے عوام الناس کی حالت زار کے
متعلق اعداد و شمار پیش کر چکے ہیں اب ریاستوں کا برطانوی ہند
سے مقابلہ کرتے ہیں۔ برطانوی ہند میں تعلیم پر فی کس ۹ شلنگ صرف ہوتے
ہیں۔ حفظان صحت پر ۵ شلنگ۔ اور اوسط شرح ٹیکس ۹ شلنگ فی کس ہے
ریاست بیکانیر فی کس تعلیم پر ۵ شلنگ اور حفظان صحت پر ۴ شلنگ صرف
کرتی ہے۔ لیکن شرح ٹیکس فی کس ایک پونڈ ۲ شلنگ ہے۔ ریاست اندور
تعلیم پر فی کس ۷ شلنگ اور حفظان صحت پر ۲ شلنگ صرف کرتی ہے جبکہ
شرح ٹیکس ۱۸ شلنگ فی کس ہے۔ ریاست نواں نگر میں ہر فرد ایک پونڈ ۱۰ شلنگ
ٹیکس ادا کرتا ہے۔ یا یہ کہیئے کہ برطانوی ہند کے ٹیکس سے ۳ گنا زیادہ۔ مگر ریاست تعلیم پر
۸ شلنگ اور حفظان صحت پر ۳ شلنگ صرف کرتی ہے چند ایک کی حالت
بدترین ہے شرح ٹیکس فی کس ایک پونڈ ۱۰ شلنگ ہے رفاہِ عامہ
کے لئے ۳ شلنگ فی کس کے حساب سے خرچ ہوتا ہے اور بس مہاراجہ صاحب
الور صحت عامہ پر ایک شلنگ اور تعلیم پر ۳ شلنگ صرف کرتے ہیں ایک
بنظیر مہاراجہ صاحب کے کروڑ روپیہ سے ۲ لاکھ سالانہ صحتِ عامہ پر صرف کرتے ہیں
چند ایک ریاستوں کو چھوڑ کر اعلےٰ افسران کہیں کسی خاص
خوبی اور قابلیت کی بنا پر نامزد نہیں کیئے جاتے۔ یہ ایک مشہور بات ہے
کہ بہترین قابلیت حکمران کا رشتہ دار ہونا ہے۔ حضور مہاراجہ صاحب کے منظورِ نظر

کے لئے ترقی کے تمام ذرائع موجود ہوتے ہیں۔ اکثر ریاستوں میں کامیابی کا بہترین طریقہ حکمران کے لئے نت نئی رفیقۂ شب مہیا کرنا ہے

چند ریاستوں کی استثنا کے بغیر جن میں پبلک سروس کا نام موجود ہے فرائض کی ادائیگی میں کسی اصول کی پیروی نہیں کی جاتی۔ چیف جج بننے کے لئے مالیات میں ماہر ہونے کی ضرورت ہے۔ پنجاب کی ایک ریاست میں محکمہ حفظانِ صحت کے ایک انسپکٹر ڈائریکٹر آف انڈسٹریز بھی ہیں ایک اور ریاست میں محکمہ عدل سے کپاس کے موسم میں مالیہ اکٹھا کرنے کا کام لیا جاتا ہے

محکمۂ عدل و ایگزیکٹو کی تنخواہیں نہایت قلیل ہیں برطانوی ہند میں ایک ڈپٹی کمشنر ۸۰۰ سے ۱۲۰۰ ماہوار کے درمیان تنخواہ پاتے ہیں اتنی پوزیشن کے افسر کو ریاست میں ۱۰۰ روپیہ یا اس سے کم ماہوار تنخواہ ملے گی۔ ایک طرف حکمران ہے جس کی تنخواہ عام لوگوں سے دو سو گنا زیادہ ہے۔ دوسری طرف ریاست کے افسران ہیں جن کی تنخواہیں کسی اور جگہ کی نسبت آٹھ دس گنا کم ہیں۔

معمولی سپاہی آبادی کی غلاظت سے بھرتی کیئے جاتے ہیں ان سینکڑوں میں صرف ایک معمولی طور پر لکھا پڑھا ہوتا ہے۔

ناخواندہ ہونے کے علاوہ انہیں نہ تو اپنے فرائض منصبی کا احساس ہوتا ہے۔ اور نہ ہی ضروری تربیت اور علم سے آشنا ہوتے ہیں اوسط تنخواہ ۳ سے ۱۰ روپیہ ماہوار کپتان پولیس کی تنخواہ ۳۰۰ سے ۴۰۰ روپیہ کے درمیان ہوتی ہے اس کا نتیجہ رشوت ستانی اور اخلاقی تنزل ہے۔ تقریباً ۵۰ فیصدی جرائم کی کبھی سراغ رسانی نہیں ہوئی بمشکل

۳۰ فی صدی مال مسروقہ برآمد ہو سکتا ہے۔ اور مقدمات میں اصل مجرم
شاذ و نادر ہی سزا پاتا ہے۔ بیگناہ ملزموں پر بناوٹی ثبوت کے ماتحت
مقدمات چلائے جاتے ہیں جس کی تصدیق جھوٹے گواہ کر دیتے
ہیں۔ لوگوں کو بے پناہ ظلم کا شکار بنایا جاتا ہے۔ مگر کوئی پر اثر کاروائی عمل
میں نہیں لائی جاتی۔

اب ماتحت عدالتوں کو لیجیئے۔ ان کی داستان اور بھی المناک
ہے۔ ان عدالتوں میں چند افسران بلاشبہ سند یافتہ ہوتے ہیں مگر تنخواہیں بہت
قلیل پاتے ہیں عدالتہائے بالا میں افسران تجاہل و تساہل کا نمونہ ہوتے ہیں
یہ بھی ان کی پیروی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں کئی ضمنی فرائض سرانجام
دینا پڑتے ہیں۔ سب جج اور مجسٹریٹ ۱۰۰ سے ۱۵۰ کے درمیان تنخواہ پاتے
ہیں۔ اس لیئے ان سے انصاف کی توقع رکھنا عبث ہے۔ جن ریاستوں
میں ہائی کورٹیں موجود ہیں وہاں حالات اور بھی دگرگوں ہیں۔ عموماً حکمران
انصاف و عدل کا آخری سرچشمہ ہوتے ہیں مگر انہیں عدالتی امور کی طرف
توجہ دینے کی بہت کم فرصت ملتی ہے۔

ایگزیکٹو کے افسر اعلیٰ دیوان یا وزیر اعظم ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں
ان مناصب پر قابل ذکر افراد ممتاز رہیں۔ جنکی قابلیت لیاقت اور خدمات
مسلمہ ہیں۔ مگر چونکہ وہ اجنبی ہوتے ہیں۔
اس لیئے انہیں۔ لوگوں کے مفاد سے دلچسپی نہیں ہوتی۔
اور نہ ہی اس بات کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اولیں فرصت میں اپنی
پوزیشن مضبوط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اس غرض کو والیٔ
ریاست کی خوشامد سے سرانجام دیتے ہیں اور اپنی بدعنوانیوں کو خوبیوں

کا رتبہ دیتے ہیں۔
ریاستوں میں آبادی کا ۸۷ فیصدی دیہات میں آباد ہے ان کا دار و مدار کلیتاً کھیتی باڑی پر ہے۔ جس میں بارش کی کمی بیشی سے نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ کاشتکار لوگ جہالت و غربت کے قعرِ مذلت میں پڑے ہیں۔ ریاستوں کے حکمران ان کی طرف ذرا دھیان نہیں دیتے

۱۹۲۱ء کی رپورٹ مردم شماری کے مطابق صرف وسط ہند اور راجپوتانہ ریاستوں میں ۱۶۰،۷۵۵ غلام تھے۔ جن میں ۱۰۸۸۶ بیکانیر اور جودھ پور کے ۶۸۱۰۰ غلام شامل ہیں وہ کئی ناموں سے مشہور ہیں مثلاً دارد گاسس۔ راجپوت چیلہ اور گلاسس۔ ان کے آقا ہندو اور مسلمان والیانِ ریاست ہیں۔ وہ اپنے آقاؤں کے عمر بھر کے غلام ہیں سوائے معمولی ضروریاتِ زندگی کے انہیں کسی چیز پر حقِ ملکیت حاصل نہیں۔ ان کے آقا اُن کی بیویوں اور لڑکیوں کو فروخت کرنے کا حقِ استعمال کرتے ہیں۔ اور کافی حد تک اِن کی شادیوں اور طلاقوں پر اختیار رکھتے ہیں اگر کہیں بھاگ نکلیں تو قانوناً واپس لوٹائے جانیکے مجاز ہیں

جودھپور کی یہ حالت ہے کہ غلام حسب منشا کام نہ کریں تو قانوناً انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ راجپوتوں کے گھروں میں جنم لینے والے دارد گاسوں کی لڑکیاں راجپوت اپنی لڑکیوں کے جہیز میں دیتے ہیں کوٹہ ریاست میں زرعی مزدور۔ جو اچھے اور مزارع کسی ریاست میں ہجرت کرنے کے مجاز نہیں جب تک مالک رضامند نہ ہو جائیں اور نہ کوئی سرکاری ملازمت حاصل کر سکتے ہیں۔

کے لئے ترقی کے تمام ذرائع موجود ہوتے ہیں۔ اکثر ریاستوں میں کامیابی
کا بہترین طریقہ حکمران کے لئے نت نئی رفیقۂ شب مہیا کرنا ہے

چند ریاستوں کی استثنا کے بغیر جن میں پبلک سروس کا نام موجود
ہے فرائض کی ادائیگی میں کسی اصول کی پیروی نہیں کی جاتی چیف جج بننے
کے لئے مالیات میں ماہر ہونے کی ضرورت ہے۔ پنجاب کی ایک ریاست
میں محکمہ حفظان صحت کے ایک انسپکٹر ڈائریکٹر آف انڈسٹریز بھی ہیں
ایک اور ریاست میں محکمہ عدل سے کپاس کے موسم میں مالیہ اکٹھا
کرنے کا کام لیا جاتا ہے

محکمۂ عدل و ایگزیکٹو کی تنخواہیں نہایت قلیل ہیں برطانوی ہند
میں ایک ڈپٹی کمشنر ۸۰۰ سے ۱۲۰۰ ماہوار کے درمیان تنخواہ پاتے ہیں
اتنی پوزیشن کے افسر کو ریاست میں ۱۰۰ روپیہ یا اس سے کم ماہوار تنخواہ
ملے گی۔ ایک طرف حکمران ہے جس کی تنخواہ عام لوگوں سے دوسو گنا زیادہ
ہے۔ دوسری طرف ریاست کے افسران ہیں جن کی تنخواہیں کسی اور جگہ کی
نسبت آٹھ دس گنا کم ہیں۔

معمولی سپاہی آبادی کی غلاظت سے بھرتی کیئے جاتے ہیں ان
سینکڑوں میں صرف ایک معمولی طور پر لکھا پڑھا ہوتا ہے۔
ناخواندہ ہونے کے علاوہ انہیں نہ تو اپنے فرائض منصبی کا
احساس ہوتا ہے۔ اور نہ ہی ضروری تربیت اور علم سے آشنا ہوتے ہیں
اوسط تنخواہ ۳ سے ۱۰ روپیہ ماہوار کپتان پولیس کی تنخواہ ۳۰۰ سے ۴۰۰
روپیہ کے درمیان ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ رشوت ستانی اور اخلاقی تنزل
ہے۔ تقریباً ۵۰ فیصدی جرائم کی کبھی سراغ رسانی نہیں ہوئی بمشکل

۳۰ فی صدی مال مسروقہ برآمد ہو سکتا ہے۔ اور مقدمات میں اصلی مجرم شاذونادر ہی سزا پاتا ہے۔ بیگناہ ملزموں پر بناوٹی ثبوت کے ماتحت مقدمات چلائے جاتے ہیں جس کی تصدیق جھوٹے گواہ کر دیتے ہیں۔ لوگوں کو بے پناہ ظلم کا شکار بنایا جاتا ہے۔ مگر کوئی پر اثر کاروائی عمل میں نہیں لائی جاتی۔

اب ماتحت عدالتوں کو لیجیئے۔ ان کی داستان اور بھی الم ناک ہے۔ ان عدالتوں میں چند افسران بلاشبہ سند یافتہ ہوتے ہیں مگر تنخواہیں بہت قلیل پاتے ہیں عدالتہائے بالا میں افسران تجاہل و تساہل کا نمونہ ہوتے ہیں یہ بھی ان کی پیروی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں کئی ضمنی فرائض سرانجام دینا پڑتے ہیں۔ سب جج اور مجسٹریٹ ۱۰۰ سے ۱۵۰ کے درمیان تنخواہ پاتے ہیں۔ اس لیئے ان سے انصاف کی توقع رکھنا عبث ہے۔ جن ریاستوں میں ہائی کورٹیں موجود ہیں وہاں حالات اور بھی دگرگوں ہیں۔ عموماً حکمران انصاف و عدل کا آخری سرچشمہ ہوتے ہیں مگر انہیں عدالتی امور کی طرف توجہ دینے کی بہت کم فرصت ملتی ہے۔

ایگزیکٹو کے افسر اعلیٰ دیوان یا وزیر اعظم ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں ان مناصب پر قابل ذکر افراد ممتاز رہیں۔ جنکی قابلیت لیاقت اور خدمات مسلمہ ہیں۔ مگر چونکہ وہ اجنبی ہوتے ہیں۔

اس لیئے انہیں۔ لوگوں کے مفاد سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی اس بات کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اولیں فرصت میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اس غرض کو والئی ریاست کی خوشامد سے سرانجام دیتے ہیں اور اپنی بدعنوانیوں کو خوبیوں

کا رتبہ دیتے ہیں۔

ریاستوں میں آبادی کا ۸۷ فیصدی دیہات میں آباد ہے ان کا دار ومدار کلیتاً کھیتی باڑی پر ہے۔ جس میں بارش کی کمی بیشی سے نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ کاشتکار لوگ جہالت و غربت کے قعرِ مذلت میں پڑے ہیں۔ ریاستوں کے حکمران ان کی طرف ذرا دھیان نہیں دیتے

۱۹۲۱ء کی رپورٹ مردم شماری کے مطابق صرف وسط ہند اور راجپوتانہ ریاستوں میں ۱۶۰,۷۵۵ غلام تھے۔ جن میں ۱۰۸۸۶ بیکانیر اور جودھپور کے ۶۸۱۰۰ غلام شامل ہیں وہ کئی ناموں سے مشہور ہیں مثلاً دارو گاسس۔ راجپوت چیلہ اور گلاسس ان کے آقا ہندو اور مسلمان والیانِ ریاست ہیں۔ وہ اپنے آقاؤں کے عمر بھر کے غلام ہیں سوائے معمولی ضروریاتِ زندگی کے انہیں کسی چیز پر حق ملکیت حاصل نہیں۔ ان کے آقا اُن کی بیویوں اور لڑکیوں کو فروخت کرنے کا حق استعمال کرتے ہیں۔ اور کافی حد تک اِن کی شادیوں اور طلاقوں پر اختیار رکھتے ہیں اگر کہیں بھاگ نکلیں تو قانوناً واپس لوٹائے جانیکے مجاز ہیں

جودھپور کی یہ حالت ہے کہ غلام حسب منشا کام نہ کریں تو قانوناً انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ راجپوتوں کے گھروں میں جنم لینے والے دار وگاسوں کی لڑکیاں راجپوت اپنی لڑکیوں کے جہیز میں دیتے ہیں کوٹہ ریاست میں زرعی مزدور۔ جرو اہے اور مزارع کسی ریاست میں ہجرت کرنے کے مجاز نہیں۔ جب تک مالک رضامند نہ ہو جائیں اور نہ کوئی سرکاری ملازمت حاصل کر سکتے ہیں۔

ریٹھ اور بیگار کا رواج تقریباً تقریباً تمام ریاستوں میں موجود ہے۔ اور مزدوروں اور کاریگروں کے طبقے اپنے حکمرانوں اور افسران کیلئے اتنے معاوضہ پر کام کرنے کو مجبور کئے جاتے ہیں جو دراصل ان کی معمولی خوراک سے زیادہ نہیں ہوتا۔ ریاست انہیں ہر وقت اور جتنے عرصہ کے لئے چاہے بیگار پر لگا سکتی ہے انہیں اپنے گھروں سے دور دراز دیہات جنگلات اور پہاڑوں میں کام کیلئے سفر کرنا پڑتا ہے۔ جہاں مہاراجے اور ان کے مہمان شکار پر یا افسران دورہ پر جاتے ہیں۔

ریاست بندی کے آئین وضوابط کے مطابق لوگوں کے کئی طبقے مثلاً حجام تیلی۔ بیپاری فروش۔ قصاب۔ کسان اور جعیل مفت کام کرنے پر مجبور ہیں یا انہیں ایندھن۔ ڈھوروں کے کھالیں۔ اور خشک اوپلے مفت فراہم کرنا پڑتے ہیں ریاستی مقاصد پر حاصل کئے گئے کام کے عوض کھانا کھلایا جاتا ہے اور ریاستی ملازموں کے کام پر اجرتیں ادا کرنا پڑتی ہیں۔ جو محض نام کی اجرتیں ہوتی ہیں (ٹائمز آف انڈیا۔ ۱۹۲۶ء جمعیت اقوام کی تحقیقات)

لوگوں کی حالت

رہائشی حالت:- پرجا بڑی بڑی عالیشان کوٹھیوں عظیم الشان بنگلوں میں نہیں رہتی۔ اور نہ ہی انہیں بجلی کے پنکھے اور خس کی ٹٹیاں میسر ہیں۔ پرجا کے مکان بقول ایک انگریز رائیٹر کے کیچڑ کے صندوق ہیں۔ گاؤں میں جہاں پرجا کی اکثریت بستی ہے۔ بجلی تو درکنار۔ رسل و رسائل کے ذرائع تک موجود نہیں۔ اولاً تو وہاں پہنچنا آسان نہیں۔ برسات کے موسم میں تو خاص طور پر تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خراب اور ناہموار کچی سڑکیں ٹانگوں اور گھوڑا گاڑیوں کیلئے خاص طور پر ناموزوں ہوتی ہیں۔

گاؤں کے تمام مکانوں کی یہ کیفیت ہے کہ ان کی چھتیں نیچی بناوٹ بھدی اور کمزور اور دیواریں اور فرش کچے ہوتے ہیں۔ بنگال میں دیہاتی جھونپڑیاں بانس اور لکڑی سے بنائی جاتی ہیں۔ پنجاب کو ہندوستان کا فارغ البال صوبہ خیال کیا جاتا ہے۔ اور ایسے مالک زمینداروں کی سرزمین کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کے باوجود وہاں دیہاتی مکانوں کی چھتیں نیچی ہوتی ہیں اور روشندان اور کھڑکیاں سرے سے موجود نہیں ہوتے۔

ہمارے دیس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ دیہات شہروں کی نسبت زیادہ گنجان ہیں۔ مدراس کی مردم شماری کے مطابق اچھوتوں کے گھروں کو رہائش کی بدترین جگہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن کسانوں کے گھروں کی حالت بھی ان سے بہتر نہیں ہے۔ شمالی ہندوستان کے دیہاتی مکانات عموماً گلیوں اور نالیوں وغیرہ کا خیال

رکھے بغیر تعمیر کئے جاتے ہیں۔ جہاں بعض اوقات اتنا کوڑا کرکٹ جمع ہو جاتا ہے کہ
گزرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ گلیوں میں غلاظت اور گندا پانی ہر وقت جمع رہتا ہے جو
بعض اوقات ایک بدرو کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور برسات میں تو یہاں بڑے
بڑے بدبودار گڑھے بن جاتے ہیں۔ جن میں مچھر کثرت سے ہوتا ہے انہیں
گڑھوں سے مال مویشی پانی پیتے ہیں۔ اور بعض اوقات دیہاتی نہا بھی لیتے ہیں
پنڈی گھیپ ضلع کیمبلپور میں راقم الحروف کو ایسے کئی جوہڑوں کے دیکھنے کا موقع
ملا۔ جہاں پانی کی قلت کی بنا پر لوگ ان ہی جوہڑوں کے پانی کپڑوں سے چھان کر
پیتے ہیں۔ ان جوہڑوں میں چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑوں اور مینڈکوں کا
کوئی شمار نہیں۔ یو۔ پی میں لوگ نہایت چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں دس
دس بارہ بارہ افراد تک رہائش رکھتے ہیں۔ یہ مکانات بقول ایک سرکاری رپورٹ
کے نہایت گندے اصول حفظان صحت سے کوسوں دور ہیں رہائشی مکانات کے
قریب گندے پانی کے جوہڑ اکثر پائے جاتے ہیں جن میں گھروں کا مستعمل
پانی بے راستہ گلیوں کو گندا اور گیلا کرتا ہوا ان جوہڑوں میں جا گرتا ہے

ان دیہات میں بجلی تو درکنار مٹی کا تیل بھی میسر نہیں ہوتا۔ بلکہ مٹی کے
دیئے ہیں جن میں سرسوں یا رائی کا تیل استعمال کیا جاتا ہے۔ جب تیل
مٹی کے دیئوں میں جلایا جاتا ہے۔ تو دھواں کمرے کی ہوا کو اسقدر متعفن
کر دیتا ہے کہ سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے۔ ایک ہی کمرے میں کھانا پکتا ہے
وہیں کھایا جاتا ہے اور کھانے پکانیکے بعد اسی کمرے میں سو جاتے ہیں۔ چولہے
میں آگ جلتی رہتی ہے۔ مگر دھواں باہر نکلنے کے لئے کوئی بند و بست نہیں ہوتا
مزدوروں کے رہنے کی جگہیں اس سے بری ہیں۔ کسانوں کو اچھا
برا رہنے کا گھر حاصل ہے۔ دیہاتوں میں مثل مشہور ہے کہ جو لطف اپنے چھجو

کے چبا رہے ہیں ہے وہ بلخ اور بخارا میں بھی ملنا دشوار ہے۔ کسانوں کو سر چھپانے کا اپنا گھر حاصل ہے مزدور بیچارا اس سے بھی محروم ہے اس کے رہنے کی جگہ جانوروں سے بھی بدتر ہے بمبئی کے صنعتی مزدوروں کا ۹۰ فی صدی حصہ ایسے مکانوں میں رہتا ہے جنکے ایک ایک کمرہ میں کم و بیش پانچ۔ پانچ مزدور بستے ہیں۔ ایک تحقیقات کے دوران میں معلوم ہوا کہ ایک کمرہ میں جس کا طول و عرض ۱۲ × ۱۵ تھا چھ خاندان رہتے تھے فرش پر چھ علیحدہ علیحدہ چولہوں نے اس کا ثبوت فراہم کر دیا۔ پوچھنے پر بتایا گیا کہ اس کمرہ میں بچوں اور بالغان کی صحیح تعداد ۳۰ افراد پر مشتمل ہے۔ چھت پر بانس لٹکے ہوئے تھے رات کو ان بانسوں کے ساتھ کپڑے لگا لیئے جاتے۔ اس طرح ہر خاندان علیحدہ علیحدہ رات بسر کر سکتا ہے۔ کلکتہ اور بمبئی مستثنےٰ نہیں۔ تمام ہندوستان کی یہی کیفیت ہے بڑے بڑے شہروں میں ہزاروں مزدور باہر بازاروں اور گلیوں میں سوتے ہیں کیوں کہ کمروں میں انہیں سونے کی جگہ نہیں مل سکتی۔

معیارِ زندگی۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ اعلیٰ معیار زندگی رکھنے کے لئے اچھی خاصی آمدنی کی ضرورت ہے ہمارے دیس میں پرجا کی اکثریت ایسی ہے جسے ایک وقت کھانے کو ملتا ہے تو دوسرے وقت خدا حافظ ہے یہ نہ تو کوئی کہاوت ہے اور نہ ہی پہیلی بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اندازہ حسبِ ذیل اعداد و شمار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

ہندوستان میں چھ ہزار انسان ایسے ہیں جن کی اوسط آمدنی ایک لاکھ روپیہ ہے یہاں ایک خاندان اوسطاً پانچ افراد پر مشتمل تصور کیا جاتا ہے۔ اس حساب کے مطابق یہ چھ ہزار انسان تیس ہزار افراد کے گزارہ کے

کفیل ہوتے ہیں۔ یعنی ملک کے ساٹھ کروڑ روپیہ پر چھ ہزار خاندان اکیلے ہی گلچھرے اڑا رہے ہیں۔ دو لاکھ تیس ہزار انسان ایسے ہیں جنکی اوسط آمدنی پانچ ہزار روپیہ سالانہ ہے۔ یہ وہ افراد ہیں جن کا انکم ٹیکس یا تو معاف ہے یا کسی بہانے ادا کرنے سے بچ جاتے ہیں۔ اس طرح ۱۳۵ کروڑ روپیہ یہ لوگ ہڑپ کر جاتے ہیں۔ چھبیس لاکھ انسانوں کی ایک ہزار روپیہ سالانہ اوسطاً آمدنی ہے جن کے حصہ میں دو سو کروڑ روپیہ آتا ہے۔ تین کروڑ پچاس لاکھ انسان ایسے ہیں جنکی اوسط آمدنی دو سو روپیہ سالانہ ہے اور جنہیں صرف ۷۰ کروڑ روپیہ ملتا ہے۔ باقی کی اوسط آمدنی پچاس روپیہ سالانہ ہے۔ اور یہ لوگ اپنے بال بچوں پر ۸۲۵ کروڑ روپیہ صرف کرتے ہیں یعنی ملک میں صرف ۷ لاکھ چھبیس ہزار خاندانوں کو پیٹ بھر کر اپنی مرضی سے ہر چیز کھانے پہننے اور عیش و تفریح کیلئے حاصل ہوتی ہے۔ ۷ کروڑ پچاس لاکھ انسان بمشکل گزر اوقات کرتے ہیں اور ملک کی آدھے سے زیادہ آبادی نانِ شبینہ تک کی محتاج ہے بھوک افلاس اور بے کسی میں دن کاٹتی ہے۔ اگر ایک وقت روکھی سوکھی مل جاتی ہے تو دوسرے وقت کا خدا حافظ ہوتا ہے۔

جن ۷½ کروڑ انسانوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی حالت بھی ایسی نہیں کہ من بھاتا کھا جا کھا سکیں۔ البتہ وہ مؤخر الذکر آبادی کے نصف سے زیادہ حصہ کی طرح بھوکے نہیں مرتے وقت گزارنے کو کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے۔ ان اعداد و شمار کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کل آمدنی کا ایک تہائی پانچ فیصدی افراد کے پاس چلا جاتا ہے ۳۵ فیصدی سے لگ بھگ آبادی کا ایک تہائی حصہ صرف کرتا ہے اور باقی ۶۲ فیصدی ۳۰ فیصدی پر

گزر اوقات کرتا ہے۔ ملک کی ۶۲ فیصدی آبادی کی تنگدستی کسمپرسی اور خستہ
حالی کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ چار روپیہ ۲ آنہ ۹ پائی ماہوار میں وقت گزارنا
آسان نہیں۔ یہ غربت ہے یا پیغامِ موت؟ زندگی۔ یا زندہ درگور ہونا؟

اس کے علاوہ مذکورہ بالا اعداد و شمار سماج میں موجودہ عدم مساوات
کی زندہ تصویر ہیں۔ ملک کی دولت کا بہت بڑا حصہ چند طفیلی نکھٹو اور دوسروں
کی محنت پر عیش کرنے والوں کے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے اور خود محنت کش
دولت پیدا کرنیوالی آبادی کا ۲/۳ دو تہائی بھکاریوں کی زندگی بسر کرتا ہے
اور اُن کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔

آیئے ذرا بحیثیت مجموعی ملک کی اوسط آمدنی کا مطالعہ کریں۔ اس نکتہ پر
تحقیقات کرنیوالے کبھی بھی اتفاق نہیں کرتے۔ مختلف اندازے و تخمینے لگائے جاتے
ہیں اور اگر کسی نکتہ پر متفق ہیں تو یہ ہے کہ ہندوستان کی غربت مسلمہ اور ناقابل
تردید ہے۔ غریبی کا یہ مفہوم نہیں کہ لوگ اپنی خواہش کے مطابق معیار زندگی
برقرار رکھنے کے قابل نہیں جیسا کہ انگلستان یا امریکہ میں بلکہ یہ مفلسی اور
بے نوائی کی انتہا ہے۔ جو لوگوں کی بڑی بھاری اکثریت کو بقا کی سطح سے
بھی نیچے رکھتی ہے

ہمارے ملک کی کل آمدنی تقریباً ۱۶ سو کروڑ روپیہ ہے برطانوی
ہند میں بسنے والی آبادی تقریباً تقریباً ۳۰ کروڑ ہے ان اعداد و شمار کے
مطابق ہر ہندوستانی کی ۵۳ روپیہ ۵ آنے ۴ پائی سالانہ آمدنی ہوتی ہے جن
میں سے اگر امپیریل صوبائی اور لوکل باڈیز کو ادا کئے جانے والے ۸ روپے
۵ آنے ۸ پائی نکال دیئے جائیں تو ایک ہندوستانی کے پاس پینتالیس روپیہ
سالانہ رہ جاتا ہے یعنی تقریباً پونے چار روپیہ ماہوار اس کے بالمقابل ایک

اور تحقیق ذرا حوصلہ افزا ہے۔ اس تحقیق میں ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۲ء تک کی اوسط آمدنی فی کس کا اندازہ لگایا گیا ہے

سال	اوسط آمدنی فی کس
۱۹۲۳-۲۴ء	۱۱۷
۱۹۲۴-۲۵ء	۱۲۶
۱۹۲۵-۲۶ء	۱۱۴
۱۹۲۶-۲۷ء	۱۰۸
۱۹۲۷-۲۸ء	۱۰۸
۱۹۲۸-۲۹ء	۱۰۶
۱۹۲۹-۳۰ء	۱۰۹
۱۹۳۰-۳۱ء	۸۴
۱۹۳۱-۳۲ء	۶۳
۱۹۳۲-۳۳ء	۵۸

اگر تنزل کی یہی حالت رہی تو کہا نہیں جا سکتا کہ کیا حال ہو کر رہے۔

اپنی حالتِ زار کا اندازہ بیگانوں کے اعلیٰ معیار سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ انگلستان کا ایک غریب سے غریب بیکار مزدور یا کسان اپنی سگریٹوں اور شراب پر ایک ہندوستانی کی اوسط آمدنی سے بہت زیادہ خرچ کرتا ہے۔ برطانیہ عظمیٰ میں ہر ہفتہ ۱۵ لاکھ بے کاروں میں ۲ کروڑ ۷۰ لاکھ روپیہ تقسیم کیا جاتا ہے۔ یعنی پنجاب حکومت کی تمام آمدنی کا پانچواں حصہ۔ علاوہ ازیں غربا کی امداد پر ۴۲ کروڑ روپیہ سالانہ تقسیم کیا جاتا ہے جو ایک ہندوستانی

کی اوسط آمدنی سے پانچ گنا زیادہ ہے۔ بقیہ ملکوں کی اوسط آمدنی حسب ذیل ہے۔

فی کس سالانہ آمدنی

نام ملک	روپیہ	نام ملک	روپیہ
جاپان	۲۷۴	کینیڈا	۱۲۶۸
جرمنی	۶۳۴	ریاستہائے متحدہ	۱۹۰۲
فرانس	۶۳۶	برطانیہ	۲۰۵۳

یہاں پر یہ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہندوستان کی آبادی کا ترقی کرنا کوئی انوکھی چیز نہیں یہ ترقی حقیقت میں اس ترقی سے کہیں کم ہے جو اٹھارویں صدی کے دوران میں انگلستان میں ہوئی انگلستان کی آبادی پچھلے پچاس سالوں میں ۴۵ فیصدی بڑھی جبکہ ہندوستان کی آبادی صرف ۳۹ فیصدی

ہندوستان کی ممکن اقتصادی طاقتوں کا بھی خاتمہ نہیں ہوا۔ صنعت اور زراعت بتدریج شاہراہ ترقی پر گامزن ہیں اور اگر ضرورت کے مطابق ان کی حوصلہ افزائی کی جائے تو غیر معمولی طور پر بڑھنے کی اہلیت رکھتی ہیں اس جگہ لیونا روم شف کی آبادی کی افزائش" پر "ہندوستان کی موجودہ حالت" نامی کتاب سے رائے پیش کر دینا نہایت موزوں ثابت ہوگا۔ آپ رقمطراز ہیں کہ "۱۸۹۱ء سے ۱۹۰۵ء کے درمیان میں آبادی کے اضافہ کا تناسب ½۱۲ اور ہندوستان میں ۴ فیصدی تھا۔ لہٰذا ہندوستان میں آبادی کے اضافہ کی رفتار انگلستان سے بہت کم ہے۔ بایں ہمہ ہندوستان غریب ہوا۔ نہ کہ انگلستان۔ یہ چیز قابل غور ہے کہ ہندوستان نہ صرف اپنے لئے خوراک مہیا کرتا ہے بلکہ دوسرے ممالک کیلئے بھی۔ اور اس کے مقابلہ میں انگلستان میں تو کھانے کی درآمد ہوتی ہے۔ ہندوستان میں تو ایک ہزار میں سے ۲۲۹ آدمیوں کو پیٹ بھر کھانا نصیب

ہوتا ہے۔ مسٹر سی۔ پی۔ رائے نے جو فہرست بنائی ہے اس میں ہندوستان کا ساتواں نمبر ہے۔ یورپ کے اکثر دوسرے ممالک میں آبادی کا تناسب ہندوستان سے بہت زیادہ ہے۔ فسطائی پروپیگنڈا نے تو آبادی کے سوال کو اپنی ملوکیت پسندانہ جوع الارضی کیلئے ایک بہانہ بنا لیا ہے۔ مگر بہت سے اہل قلم نے لکھا ہے کہ یہ اصل وجہ نہیں ہے۔ یہ چیز نہایت ہی مشکوک ہے کہ کوئی ملک اپنی موجودہ آبادی سے زیادہ تعداد کے لئے کفایت نہ کر سکتا ہو ہندوستان یقیناً اپنے باشندوں کے لئے کھانا مہیا کر سکتا ہے۔ یہ کس قدر افسوسناک اور اندوہناک بات ہے کہ بچے موت کی آغوش میں ابدی نیند سونے کے لئے پیدا ہوں۔ اور فاقوں کی وجہ سے عدم آباد کی راہ لیں پیدائشوں کی کثرت تعداد غربت کا باعث نہیں۔ اگر چند دوسری وجوہات موجود نہ ہوتیں۔ تو یہی بچے بڑھتے۔ پھلتے اور پھولتے جوان ہوتے خوش و خرم۔ صحت مند اور توانا ہوتے۔

اس کے علاوہ قدرت کا ہاتھ آبادی کی کانٹ چھانٹ میں بھی مشغول رہتا ہے۔ ہندوستان میں ۱۸۷۶-۷۸ء اور ۱۸۹۰-۹۱ء کے قحط اور طاعون نے آبادی کا اچھی طرح صفایا کیا۔ ۱۹۱۸-۱۹ء کے قحط اور انفلوانزا نے تو قیامت بپا کر دی۔ ہر گلی کوچہ سے آہ و بکا کی آوازیں آنے لگیں۔ قبرستانوں اور مرگھٹوں میں کھڑا ہونا دشوار ہو گیا۔ مردوں کو دفنانے اور جلانے کے لئے گھنٹوں کھڑے ہو کر انتظار کرنا پڑتا۔ آبادی کا ۷ فیصدی یعنی دو کروڑ ۲۰ لاکھ انسان اس وبا کی بھینٹ چڑھ گئے لہٰذا ہندوستان کی آبادی کا بڑھنا کوئی غیر معمولی واقع نہیں۔ اور نہ ہی اسے معیار زندگی پر اثر انداز ہونے کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

آؤ اب براہِ راست کسان کی آمدنی کا مطالعہ کریں۔ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور جنہیں ہم غریب ترین انسان کہنے کے عادی ہیں پندرہ سے پچاس روپیہ کے لگ بھگ کما لیتے ہیں۔ یہ کتنی خوفناک حقیقت ہے جس سے اُن کو اپنے تمام خاندان کا گزارہ کرنا پڑتا ہے لیکن مزدور کی اجرت اُن کروڑہا انسانوں کے مقابلہ میں جو گاؤں میں رہتے ہیں ہل جوتتے ہیں۔ ہمارے لئے کپاس اور گندم پیدا کرتے ہیں شاہانہ طور پر زیادہ ہے

ہندوستان کی ریڑھ کی ہڈی زرعی آبادی کی ماہوار اوسط آمدنی صرف تین روپیہ فی کس ہے اس حقیقت کے اعتراف میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ کہ ہمارے بدنصیب دیس کی اکثریت ایک وقت کی روٹی آسانی سے نہیں حاصل کر سکتی۔ دنیا کی آبادی کے پانچویں حصہ کے لئے خون پسینہ ایک کر کے روٹی پیدا کرنیوالا کسان خود روٹی کا محتاج ہے۔ لوگوں کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ لباس پیدا کرنیوالے کے جسم پر پھٹا پرانا کرتا بھی نظر نہیں آتا۔

کسان کی غربت کا صحیح نقشہ این۔ ایس سبھرامانیا نے اپنی ایک کتاب جنوبی ہندوستان کی دیہاتی زندگی میں کھینچا ہے۔ اور بتایا ہے کہ کس طرح بیچارے کسان کو خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر لے لیں اور بے حال کر دیا جاتا ہے۔ آپ ترچنا پلی کے ایک گاؤں جس کی آبادی ۰۰۶۲ افراد پر مشتمل ہے۔ ذکر کرتے ہوئے گاؤں کے تمام افراد کی کل آمدنی کا صحیح حساب پیش کرتے ہیں۔ یہ کیفیت گاؤں میں کی گئی مصدقہ تحقیق سے مرتب کیا گیا ہے کھیتی باڑی سے گاؤں کو ۰۰۰۴۴۳ روپے وصول ہوئے اجناس کے نرخ منڈی کے نرخوں کی بنا پر شمار کئے گئے ہیں۔ کاشت کے اخراجات کو نکال کر کھیتی باڑی سے کل آمدنی ۰۰۰۴۳ روپیہ بنتی ہے۔ اس میں گورنمنٹ

کے ملازمین کی تنخواہیں اور پنشنیں۔ سرمایہ پر سود اور گاؤں سے باہر کام کی بنا پر جو اجرتیں حاصل کی گئی ہیں شامل ہیں۔ اس طرح گاؤں کی کل آمدنی دو لاکھ چھتیس ہزار روپیہ بن جاتی ہے۔

آؤ اب گاؤں کے اخراجات اور مصارف کا حساب لگائیں۔ مالیہ، کاشت محصولات پر ۳۰۰۰۰ روپیہ صرف ہوا۔ گاؤں سے باہر مالکان اراضی کو ستر ہزار ۷۰۰۰۰ روپیہ لگان ادا کیا گیا۔ ۴۰۰۰۰ ہزار روپیہ قرضہ پر سود ادا کیا گیا۔ تاڑی و منشی اشیاء کی دکانوں کا ٹیکس حکومت کا معاملہ۔ درختوں پر ٹیکس وغیرہ ۱۲۰۰۰ روپیہ بنتا ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹے موٹے اخراجات ۱۵۶۰۰۰ روپیہ بن گئے۔ اخراجات کو آمدنی سے منہا کرنے کے بعد اہل دیہہ کے پاس ۸۰۰۰۰ روپیہ رہ جاتا ہے۔ یعنی تیرہ روپیہ فی کس۔ ہر دیہاتی کی اصل آمدنی در اصل ۳۸۰ روپیہ سالانہ بنتی ہے لیکن ٹیکس کلکٹر، زمیندار اور ساہوکار کا حصہ بانٹ دینے کے بعد ایک دیہاتی کے پاس ۱۲۳ روپے سالانہ رہ جاتے ہیں۔ کسان کی نام نہاد آمدنی کا دو تہائی لوٹ لیا جاتا ہے اب ایک تہائی یعنی ۱۲۳ روپیہ سالانہ میں ایک کسان اپنا پیٹ کس طرح پال سکتا ہے۔ کتنی بھیانک تصویر ہے کسان کی غربت اور کس مپرسی کی۔

ایک کسان کی کل پونجی اور سرمایہ اس کی عورت کا وہ سستا زیور ہوتا ہے جو ملوین دھات سے بنایا جاتا ہے۔ چند مٹی کے برتن پیتل کی ہانڈی ایک چھوٹی سی چکی۔ ایک یا دو بیل۔ اور چند نہائت ہی معمولی کھیتی باڑی کے اوزار ہنگال کے سوا۔ جہاں مچھلی کثرت سے استعمال ہوتی ہے۔ کسان عموماً ایسی خوراک کھاتے ہیں۔ جو بے مزہ ہوتی ہے۔ اور جس میں کسی قسم کا حیاتیاتی مادہ نہیں ہوتا۔ ان کی اکثریت کاشتکاری کی سختی اور زیادتی کی وجہ سے دودھ

دینے والے جانور نہیں رکھ سکتی۔ جو اس قسم کے جانور رکھتے ہیں۔ انہیں
مجبوراً اپنے گزارہ کے لئے گھی بیچنا پڑتا ہے۔ اور اُن کے گزارہ کے لئے صرف
چھاچھ رہ جاتی ہے جسے کسان نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر پیتا ہے گندم کی روٹی
سال کے چند مہینے ہی استعمال ہوتی ہے۔

معیارِ خوراک:۔ ہندوستان میں روزانہ ایک ہندوستانی سات اونس
یعنی ۳½ چھٹانک دودھ پیتا ہے۔ اور یورپ میں ہر فرد [illegible] چھٹانک بڑے بڑے گھرانوں
میں کتنے سیر دودھ صرف ہوتا ہے اور کس قدر شادیوں اور کھوئے مٹھائیوں
وغیرہ پر لگ جاتا ہے۔ یعنی ہندوستان کی اکثریت اس نعمت غیر مترقبہ
سے مستفید ہونے سے محروم رہتی ہے بمبئی کی تحقیقات سے اندازہ لگایا
گیا ہے کہ مزدوروں کے گھروں میں نصف اونس سے بھی کم فی آدمی دودھ
پیتا ہے اور تقریباً اتنا ہی مکھن کھانے کو دستیاب ہوتا ہے۔

دودھ اور مکھن تو ایک بڑی نعمت ہے۔ ہر کسی کو میسر کہاں! مگر آئیے
روز کی خوراک جو ایک ہندوستانی روزانہ کھاتا ہے۔ وہ بھی زندگی برقرار
رکھنے کیلئے کافی نہیں۔ عوام کی خوراک میں حیاتیاتی عناصر کی غیر معمولی طور پر
قلت ہوتی ہے۔ روکھی سوکھی پر ہی قناعت ہے۔ مدراس کی ایک تحقیقات
عمل میں لائی گئی۔ جن خاندانوں کے روزمرہ کے اخراجات پر غور کیا گیا تھا
انہیں ۹۵ فیصدی ایسے تھے جن کی خوراک میں دودھ۔ دہی اور ایسے دیگر
حیاتیاتی اجزا کا نام تک نہیں!۔ ہندوستان میں آبادی کے ایک بڑے
حصہ کو دن میں صرف ایک بار کھانا نصیب ہوتا ہے۔

بنگال کے کاشتکاروں کی ابتر خوراک کی یہ حالت ہے کہ خوراک جو
وہ کھاتے ہیں۔ اگر چوہے بھی کھائیں تو پانچ دن سے زیادہ زندہ نہیں

رہ سکتے۔ یہ مبالغہ نہیں اور نہ ہی اڑتی چلتی گپ۔ بنگال کے محکمہ پبلک ہیلتھ (صحت عامہ) کے ڈائرکٹر نے اپنی رپورٹ ۲۸-۱۹۲۷ء میں اس حقیقت کی تصدیق کی ہے۔

آئیے ذرا یو۔ پی۔ کی سیر کریں جو خوراک جیلوں میں قیدیوں کو دیجاتی ہے حسب ذیل ہے:-

گندم	۲۳ اونس
دال چنا	۵ "
سبزی	۴ "

اور ترکاری بنانے کے مصالحے۔

مگر اس کے بالمقابل جو خوراک یو۔ پی کے دیہات میں کھائی جاتی ہے وہ یہ ہے:-

گندم	۱۹ اونس
دال	۴ "
سبزی	۴ "

دیگر مصالحے وغیرہ

اگرچہ ملک کی مجموعی حالت کے متعلق کوئی ایسی تحقیقات نہیں کی گئی۔ جس سے ملک کی تمام آبادی کی خوراک کا پتہ چل سکے اور اعداد وشمار کی روشنی میں کوئی مسلمہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے۔ اور نہ ہی غلام ہندوستان میں کسی ایسی تحقیق کے عمل میں لائے جانے کی توقع ہے۔ جو ہندوستانی عوام کی بھوک کا مظاہرہ کرتے ہوئے امپیریلسٹ لیڈروں کی چیرہ دستیوں کے چہرہ سے نقاب اتار دے۔ مگر ہم ذاتی

سے کہہ سکتے ہیں کہ یہاں بیس فیصدی ایسے انسان ہیں جنکو نہایت ہی ردی خوراک ملتی ہے۔ ۴۱ فی صدی ردی خوراک کھاتے ہیں اور صرف ۳۹ فی صدی اپنی مرضی کی خوراک حاصل کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ نوع انسانکے پانچویں حصے کے دو تہائی کو زندگی بھر ایسی خوراک میسر نہیں ہوتی جو ایک انسان کو تندرست رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ ان ناخوشگوار اور بدترین حالات کے باوجود کسان کی پیشانی پر بل تک نہیں آتا۔ وہ تمام مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے موجودہ نظام کو جڑھوں سے اکھاڑ پھینکے گا۔

اوسط عمر۔ اس بھوک اور افلاس کا یہ نتیجہ ہے کہ لوگ مکھیوں کی طرح لاکھوں کی تعداد میں مرجاتے ہیں۔ بچوں کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی اور پیٹ ابھرے ہوئے ہیں۔ ان کی اکثریت تو ماں کی گود ہی میں مرجاتی ہے شاہی زرعی کمشن کے سرکردہ ممبر نے کہا تھا۔ کہ خراب غذا کیوجہ سے اموات کی تعداد قحط اور بیماری کی اموات سے زیادہ ہوتی ہے۔ آؤ دیکھیں کہ خوراک کی کمی نے ہماری عمروں پر کیا اثر کیا ہے۔

زندگی کے ہر لمبے پر اقوام بڑھ رہی ہیں۔ کسی کی اوسط عمر انچاس ہے۔ کسی کی پچپن۔ بدقسمت ہندوستان ہر لحاظ سے پسماندہ ہے۔ لڑکا پیدا ہوا۔ اسکی اوسط امید زندگی کیا ہے

ہندوستان	۲۲،۵۹	آسٹریلیا	۵۵،۲۰
انگلستان	۴۸،۵۳	جرمنی	۴۴،۸۲
سویڈن	۵۴،۵۳	شمالی امریکہ	۴۹،۳۲
فرانس	۵۴،۶۴	ڈنمارک	۵۴،۶۹

سوئٹزرلینڈ ہالینڈ ۴۹۶۲۵ ۵۱۶۰

ایک سال سے کم عمر کے بچوں کے مرنے کی شرح ہندوستان میں بیس فیصدی ہے۔ شہروں میں اس سے بھی زیادہ۔ بمبئی میں یہ شرح ۵۵ فیصدی کی بھی خبر اچھی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ جرمنی میں ایک سال سے کم عمر کے بچوں کی شرح اموات ہندوستان کے برابر تھی ۱۸۷۱-۷۵ء میں ۴۴۲ فی ہزار تھی اور ۱۹۳۰ء میں ۸۵ فی ہزار یعنی ۸½ فیصدی رہ گئی۔ سوئٹزرلینڈ اور ہالینڈ کی شرح اموات ۵۱ فی ہزار تھی۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی اس سے بھی کم۔

اگر فرض کیا جائے کہ ایک لاکھ لڑکے اور لڑکیاں زندہ پیدا ہوئیں تو ان میں سے مختلف ملکوں میں پانچ سال کی عمر کتنی لڑکیوں اور لڑکوں نے پائی اس کا اندازہ ذیل کے گوشوارہ سے کیا جا سکتا ہے۔

نام ملک	سمت	ایک لاکھ میں سے کتنے لڑکوں نے پانچ سال کی عمر پائی	ایک لاکھ میں سے کتنی لڑکیوں نے پانچ سال کی عمر پائی
ہندوستان	۱۹۰۱-۱۰ء	۵۵۳۰۸	۵۶۶۰۸
آسٹریلیا	۱۹۰۱-۱۰ء	۸۷۵۸۵	۸۹۲۸۵
ڈنمارک	۱۹۰۶-۱۰ء	۸۵۲۲۹	۸۷۵۵۸
انگلستان	۱۹۰۱-۱۰ء	۷۹۳۷۸	۸۲۱۷۵
فرانس	۱۸۹۸-۱۹۰۳ء	۷۷۶۹۲	۸۰۴۹۶
جرمنی	۱۹۰۱-۱۰ء	۷۴۲۱۶	۷۷۳۳۴
ہالینڈ	۱۹۰۰-۹ء	۸۰۲۴۳	۸۲۶۹۰
اٹلی	۱۹۰۱-۱۰ء	۷۲۸۱۶	۷۳۹۳۵

نام ملک	سمت	ایک لاکھ میں سے کتنے لڑکوں نے پانچ سال کی عمر پائی	ایک لاکھ میں سے کتنی لڑکیوں نے پانچ سال کی عمر پائی
جاپان	۱۸۹۸-۱۹۰۳ء	۷۶۸۸۷	۷۸۳۳۹
ناروے	۱۰-۱۹۰۱ء	۸۸۳۶۶	۸۹۹۲۲
سویڈن	۱۰-۱۹۰۱ء	۸۶۴۹۱	۸۸۲۸۵
سوئٹزرلینڈ	۱۰-۱۹۰۱ء	۸۲۴۶۹	۸۵۰۵۴
متحدہ شمالی امریکہ	۱۰-۱۹۰۱ء	۸۲۱۹۵	۸۴۶۶۸

اعداد قابلِ غور ہیں کہ ہندوستان میں پانچ سال کے اندر اندر ۳۸ - ۴۴ فی صدی کا صفایا ہو گیا۔

جس طرح بچوں کی تعداد ہماری آبادی میں زیادہ ہے بوڑھوں کی کمی ہے

نام ملک	سمت	ایک لاکھوں میں سے جو زندہ پیدا ہوئے ۹۰ سال کی عمر کتنوں نے پائی	ایک لاکھ لڑکیوں میں سے جو زندہ پیدا ہوئیں ۹۰ سال کی عمر کتنوں نے پائی
ہندوستان	۱۰-۱۹۰۱ء	۱۱	۱۱
آسٹریلیا	۱۰-۱۹۰۱	۱۹۵۲	۳۵۶۶
ڈنمارک	۱۰-۱۹۰۱	۱۹۲۸	۳۳۰۹
انگلستان	۱۰-۱۹۰۱	۱۱۱۷	۲۱۵۸
فرانس	۱۸۹۸-۱۹۰۳	۷۲۸	۱۴۵۲
جرمنی	۱۰-۱۹۰۱	۶۸۳	۱۱۳۱
ہالینڈ	۹-۱۹۰۰	۱۶۳۶	۲۳۱۷
اٹلی	۱۰-۱۹۰۱	۵۸۰	۶۴۲

ملک نام	سمت	ایک لاکھ لڑکوں میں سے جو زندہ پیدا ہوئے ۹۰ سال کی عمر کتنوں نے پائی	ایک لاکھ لڑکیوں میں سے جو زندہ پیدا ہوئیں کتنیوں نے ۹۰ سال کی عمر پائی
جاپان	۱۸۹۸-۱۹۰۳ء	۶۳۱	۱۱۴۸
ناروے	۱۰-۱۹۰۱	۳۶۵۶	۵۱۹۵
سوئٹزرلینڈ	۱۰-۱۹۰۱	۶۴۵	۱۰۲۳
متحدہ شمالی امریکہ	۱۰-۱۹۰۱	۱۹۴۲	۲۳۰۷

ہندوستان میں شاذونادر ہی کوئی ۹۰ سال کی عمر کو پہنچتا ہے
ایک سال میں اوسط اموات کی وجوہات ذیل کے گوشوارہ میں دی
گئی ہیں ملاحظہ کریں۔

نام امراض	سال ۱۹۲۶ء	سال ۱۹۳۵ء
پیچش و اسہال	۲۴۷	۲۷۹
ہیضہ	۲۲۰	۲۱۷
طاعون	۷۱	۳۲
چیچک	۸۴	۹۱
دمہ، کھانسی	۴۱۵	۴۸۳
بخار وغیرہ	۳۶۶۹	۳۷۵۵
متفرق امراض	۱۶۲۶	۱۷۲۲

ان بیماریوں کے علاوہ وہ امراض جنکا تدارک کیا جا سکتا ہے
اموات کی تعداد پچاس لاکھ سے ساٹھ لاکھ تک سالانہ ہے ہر سال
تقریباً دس لاکھ انسان ملیریا کا شکار ہو جاتے ہیں لاکھوں آتشک،
سوزاک جیسی نامراد امراض کا شکار ہیں۔ اندھوں کی تعداد ۲ لاکھ ہیں

چار سو پچاس (۴۵۰) ہے۔

ان خوفناک حالات کو طبی اور ڈاکٹری امداد کی کمی نے جو نہ ہونے کے برابر ہے اور بھی بھیانک بنا دیا ہے۔ شہروں میں ڈاکٹر بڑی بڑی دکانیں آراستہ کئے بیٹھے ہیں اور خیراتی ہسپتال بھی موجود ہیں لیکن شہری دنیا پرجا کی دنیا نہیں ہے۔ دیہات میں ہسپتالوں کا نام دلشان تک نہیں۔ دیہاتی اپنی بیماریوں کا علاج ٹونے۔ تعویذوں۔ اور گنڈوں سے کرتے ہیں۔ اور کہیں کہیں کوئی وئید یا حکیم جڑی بوٹیوں سے اُن کا گھر پورا کر دیتے ہیں۔ شہر کے خیراتی ہسپتالوں تک نہ تو اُن کی رسائی ہو سکتی ہے اور نہ ہی ان کی اقتصادی حالت انہیں اجازت دیتی ہے کہ مریض کا بستر بوریا اٹھا کر اُسے شہر میں گھماتے پھریں۔ ڈسٹرکٹ بورڈوں نے کچھ عرصہ سے دیہات میں ڈسپنسریاں کھولدی ہیں۔ لیکن اتنی بڑی آبادی میں یہ ڈسپنسریاں بہت حد تک ناکافی ہیں۔ اور کسان اگر بیماریوں سے عہدہ برا ہو جاتا ہے۔ تو اسلئے کہ اسمیں زندہ رہنے کی ایک ایسی فطری طاقت موجود ہے۔ جو کبھی دبائی نہیں جا سکتی۔ سارے ہندوستان میں ہسپتالوں کی تعداد قریباً ۷ ہزار ہے۔ جنمیں ڈسپنسریاں بھی شامل ہیں۔ جن میں ۷۰ ہزار چارپائیاں ہیں یعنی ۱۶۲۳ مربع میل میں صرف ایک ہسپتال یا ڈسپنسری ہے۔ اس ایک ڈسپنسری یا ہسپتال کو ۴۰۰۸۵ افراد کی ضروریات پورا کرنا پڑتی ہیں۔ ایک ایک شہر میں کئی کئی ہسپتال اور ڈسپنسریاں ہوتی ہیں۔ اس حساب سے دیہات میں ایک لاکھ سے بھی زیادہ افراد کے پیچھے ایک ہسپتال رہ جاتا ہے علاوہ ازیں

ملیریا عام ہونے کی وجہ سے اگرچہ کونین کی زیادہ مانگ ہے۔ اور نہایت سرگرمی سے پروپیگنڈا بھی کیا جاتا ہے کہ ملیریا کا واحد علاج صرف کونین ہی ہے۔ لیکن پھر بھی اسکی مانگ میں ۰۰۰،۰۰۰،۱ پونڈ کی کمی رہتی ہے۔ تمام ملک میں کل ۱۰۰ مراکز ایسے ہیں جو بچوں کی بہبودی کی طرف توجہ دے رہے ہیں۔ اور انھوں نے بھی اپنا حلقہ بڑے بڑے شہروں سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اور چھوٹے شہروں میں تو ایسے اداروں کا نشان تک نہیں ملتا۔

لیکن بیماریوں کی وجہ اور صورتِ حالات کی نزاکت کا باعث نہ تو ڈاکٹری امداد کا فقدان ہے اور نہ ہی کوئی اور وجہ بلکہ اس کا اصلی سبب خوراک کی کمی ہے۔ جو جسم میں اتنی قوت نہیں پیدا کرتی جو ایک انسان کے لئے ضروری ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ شرح اموات بڑھ رہی ہے۔ شرح اموات کو کم کرنے کے لئے معیارِ خوراک کا بڑھانا ضروری ہے۔ لیکن ایسا ہونا موجودہ سماج کے ماتحت ممکن نہیں ہے۔

تعلیمی حالت یکساں ہے۔ اس کی غربت اور بھوک نے ترقی کے تمام راستے بند کر دیئے ہیں۔ اس کی سیر و تفریح کیلئے کوئی سامان نہیں ڈاک خانے ان کی رہائش سے بہت دور ہیں اور اسکولوں کی تعداد تو بہت ہی کم ہے۔ اٹھارہویں صدی اور ہندوستان کے کئی صوبوں میں انیسویں صدی تک بھی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کا ایک وسیع نظام قائم تھا۔ ابتدائی طور پر علمی اور لٹریری تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن اعلیٰ

ملیریا عام ہونے کی وجہ سے اگرچہ کونین کی زیادہ مانگ ہے۔ اور نہایت سرگرمی سے پروپیگنڈا بھی کیا جاتا ہے کہ ملیریا کا واحد علاج صرف کونین ہی ہے۔ لیکن پھر بھی اسکی مانگ میں ۰۰۰،۰۰۰ پونڈ کی کمی رہتی ہے۔ تمام ملک میں کل ۶۰۰ مراکز ایسے ہیں جو بچوں کی بہبودی کی طرف توجہ دے رہے ہیں۔ اور انہوں نے بھی اپنا حلقہ بڑے بڑے شہروں سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اور چھوٹے شہروں میں تو ایسے اداروں کا نشان تک نہیں ملتا۔

لیکن بیماریوں کی وجہ اور صورتِ حالات کی نزاکت کا باعث نہ تو ڈاکٹری امداد کا فقدان ہے اور نہ ہی کوئی اور وجہ بلکہ اس کا اصلی سبب خوراک کی کمی ہے۔ جو جسم میں اتنی قوت نہیں پیدا کرتی جو ایک انسان کے لئے ضروری ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ شرح اموات بڑھ رہی ہے۔ شرحِ اموات کو کم کرنے کے لئے معیارِ خوراک کا بڑھانا ضروری ہے۔ لیکن ایسا ہونا موجودہ سماج کے ماتحت ممکن نہیں۔

تعلیمی حالت کسان کیلئے اس کی غربت اور بھوک نے ترقی کے تمام راستے بند کر دیئے ہیں۔ اس کی سیر و تفریح کیلئے کوئی سامان نہیں ڈاک خانے ان کی رہائش سے بہت دور ہیں اور اسکولوں کی تعداد تو بہت ہی کم ہے۔ اٹھارہویں صدی اور ہندوستان کے کئی صوبوں میں انیسویں صدی تک بھی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کا ایک وسیع نظام قائم تھا۔ ابتدائی طور پر علمی اور لٹریری تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن اعلیٰ

تعلیم میں فلسفہ اور مذہبی علوم شامل تھے - آج تین گاؤں میں پرائمری سکول تک موجود نہیں - ہر سو مربع میل میں صرف ایک مڈل سکول ہے اور ۲۱۵ مربع میل میں ایک ہائی سکول اور ہر چار ہزار مربع میل کیلیے ایک آرٹس کالج - چند دیہاتی علاقوں اور چند سو میونسپل کمیٹیوں کے سوا پرائمری تعلیم کہیں لازمی نہیں - جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام کی زندگی اور جہالت اقتصادی مجلسی اور سیاسی ترقی کی راہ میں دیوار کی طرح حائل ہو گئی ہے - صرف سو سے دس آدمی لکھنا پڑھنا جانتے ہیں اور ان دس میں ۲.۵ فیصدی انگریزی جانتے ہیں -

ہمارا ملک تعلیمی لحاظ سے تمام ممالک میں پسماندہ ہے - اگر پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کو چھوڑ دیا جائے تو آبادی ۲۹ کروڑ ۴۳ لاکھ رہ جاتی ہے - ان میں ۱۹۳۱ میں دو کروڑ ۳۹ لاکھ مرد اور ۴۲ لاکھ عورتیں پڑھی ہوئی تھیں - میزان ۲ کروڑ ۸۱ لاکھ بنتا ہے - ان پڑھے ہوؤں سے ۲۷ لاکھ انگریزی جانتے تھے ۲۳ لاکھ مرد ۴ لاکھ عورتیں

اگر دس سال سے کم عمر کے لڑکوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو ۱۹۳۱ء ۸۲.۶ فیصدی مرد اور ۹۶.۹ فیصدی عورتیں ان پڑھ تھیں - ترقی یافتہ ممالک میں ان پڑھوں کی تعداد آٹھ سے لیکر دس فیصدی سے زیادہ نہیں ہے حسب ذیل اعداد و شمار سے دوسرے ممالک کے ان پڑھوں کی تعداد کا پتہ چلتا ہے

ملک	سال	مرد	عورتیں	کل
مصر	۱۹۲۷	۷۶۶۹	۹۵۶۳	۸۵۶۷
کینیڈا	۱۹۲۱	۵۲۷	۴۶۴	۵۰۱

۱۹۰۶

ملک	سال	مرد	عورتیں	کل
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۱۹۲۰ء	۴٫۰	۵٫۶۹	۴٫۳۰
ہندوستان	۱۹۳۱ء	۸۲٫۶	۹۶٫۶۹	×

۱۹۱۱ء میں ہندوستان میں ۹۴ فیصدی لوگ ان پڑھ تھے ۱۹۳۱ میں ۹۲ فی صدی۔ اس رفتار سے ہندوستان کو تعلیم یافتہ بننے کے لئے پورے ۱۰۰ سال یعنی ایک صدی کی ضرورت ہے ۱۹۳۷ء میں روس کے بیالیس ہزار نو سو (۴۵۹۰۰) طلباء نے صنعتی تعلیم حاصل کی اور ہندوستان میں ۳۵-۱۹۳۴ء میں صرف ۹۶۰ طلباء نے

عوام کی تعلیم سے لاپرواہی اس بات پر روشنی ڈالتی ہے کہ ہندوستان کے حکمران یہاں مجلسی فروغ اور ترقی کے لئے نہیں آئے اور جس قدر انگریزی زبان کو ... اہمیت دی گئی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کا اس کے جاری کرنے سے یہ مقصد تھا۔ کہ اس تعلیم کے ذریعہ ایسے بابو مہیا کر لئے جائیں جو نہایت ادنےٰ سے ادنیٰ تنخواہ پر بھی کام کرنے کو تیار رہوں۔

ان حالات کے ماتحت جو تعلیمی نظام مرتب ہوا وہ تاریخ میں انتہائی طور پر بدترین اور گمراہ کن ہی ہو سکتا تھا۔ اس کا مقصد نہ تو اہل ملک کو ہمدردی تربیت دینا تھا۔ نہ ... اُن کا کیرکٹر بنانا اور نہ ہی بہتر شہری بننے کے لئے تیار کرنا یا کسی اور نصب العین یا آورش کی تعلیم دینا تھا۔ اس کے برعکس اس کا یہ مقصد تھا کہ اوسط طبقہ کے ہندوستانیوں کے دلوں پر برطانیہ کی عظمت و برتری کا سکہ

جا یا جائے انہیں اجنبی نوکرشاہی کے لائق خدمت گار بننے کی
تعلیم دی جائے یہ نہایت بدترین قسم کی پیشہ وارانہ تعلیم تھی۔ جو ایک
غیر معمولی طور پر ذہین اور لائق انسان کی ذہنی قوتوں کو مفلوج
کر دیتی ہے۔ آزادانہ تحقیق کا جذبہ کچل دیتی ہے تنقید کا شوق ختم کر دیتی
ہے اور اعصاب کا تمام زور ایسے امور پر ڈال دیتی ہے۔ جو انگریزی
صرف و نحو، شیکسپیر کی تصانیف اور اُن انگریز بادشاہوں کی سوانح
حیات سے متعلق ہوتے ہیں جنہوں نے انگلستان پر حکمرانی کی ہے

ایسی تعلیم سے پرجا کا بے بہرہ رہنا ہی مفید تھا۔ مگر بدقسمتی یہ ہے
کہ برطانوی راج نے جہاں ایک طرف دیہاتی نظام اقتصادیات کو
جڑھوں سے اکھاڑ پھینکا ہے۔ وہاں دوسری طرف پرانے تعلیمی
نظام کا قصہ بھی تمام کر دیا۔ اور ہندوستانیوں کو اُن علوم سے
دور ہٹاتے ہوئے جن کی بنا پر انہوں نے ایک وقت چار دانگ عالم
میں نام روشن کیا تھا۔ انہیں ایسا جاہل مطلق بنا دیا کہ وہ خدا
وندان برطانیہ کے ہر حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو گئے

سرزمین فرانس کی مایۂ ناز ہستیاں

والٹیر اور رُوسو

یہ وہ نامور ہستیاں ہیں جنہوں نے مردہ سرزمین فرانس میں
جہاں سرمایہ دار درندوں کی ہر طرح کی حکمرانی کا دور دورہ یعنی
غریب اور مزدور کو زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ زندگی کی روح
بھر دی۔ یہی وہ نامور ہستیاں تھیں جنہوں نے عوام میں بیداری پیدا کی جسکی بدولت
انقلاب فرانس ظہور میں آیا۔ مکمل حالات جاننے کیلئے کتاب موسومہ
والٹیر اور روسو کا مطالعہ ضروری ہے کتاب جناب ظفر کی کئی دنوں
کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے ہر پڑھے لکھے کے لئے اس کا پڑھنا بہت مفید
ہو گا۔